ڈاکٹر ہارون ایوب

ڈاکٹر ہارون ایوب

اردو دنیا کے لیے نیا نام نہیں ہے۔

اب تک آپ کی کچھ تخلیقات منظر عام پر آ چکی

ہیں۔

آجکل آپ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے

شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں

اور

غیر اردو داں حضرات کو اردو پڑھانے میں

مصروف ہیں۔

آپ کا

آبائی وطن بھوپال ہے

ابتدائی تعلیم جہانگیریہ اسکول بھوپال میں حاصل

کی بی اے سیفیہ کالج سے کیا۔ اور

ایم اے اردو (وکرم یونیورسٹی اجین) حمیدیہ

کالج بھوپال سے پاس کرنے کے بعد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی ایچ ڈی

کی ڈگری اردو میں حاصل کی۔

اساتذہ کی
درس و تدریس کے مسائل

از

ڈاکٹر ہارون ایوب

مصنف کی دیگر تصانیف

۱۔ اردو ناول پریم چند کے بعد۔ (تحقیقی مقالہ)

۲۔ شعور کی رو اور قرۃ العین حیدر۔ (تنقیدی مضامین)

۳۔ فریب تمنا (ناول)

۴۔ درد آہٹوں کا (")

۵۔ ابتدائی کتاب (تعلیم بالغاں کے لیے قاعدہ)

۶۔ اردو کی پہلی کتاب (")

۷۔ ننھی چنگاری (افسانوں کا مجموعہ) (زیر طبع)

محترم

ڈاکٹر قاضی عبدالستار

کے نام

کتاب کا نام ۔ اُردو کی درس وتدریس کے مسائل

مُصنف ۔ ڈاکٹر ہارون ایوب

ناشر ۔ بھوپال بک ہاؤس ۔ بدھوارہ بھوپال 462001

کتابت ۔ کرم سنگھ ۔ پاپیؔ

پریس ۔ پاشا پریس بھوپال

سنہ اشاعت ۔ جنوری ۱۹۸۳ء بار اول

تعداد ۔ پانچ سو

قیمت ۔ بارہ روپے

یہ کتاب مدھیہ پردیش اُردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع کی جارہی ہے ۔

باب و پر

صفحہ

صفحہ

اپنی بات

یہ انسان کے ذہنی ارتقا کا دور ہے اس میں انسان نے علم و تمدن اور سائنس میں بہت ترقیاں کی ہیں اور بہت سے اسرار پر سے پردہ اُٹھا کر ایسے ایسے انکشافات کیے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ دوسرے فنون کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان کی ترقیاں بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ جس نے تعلیم کے بہترین وسائل اور اسباب کی تلاش کی اور ہمیں ایسی چیزیں عطا کیں، جن سے آج ہم فائدہ اُٹھا کر اپنے طریقہ تعلیم میں بہت کچھ آگے بڑھ گئے ہیں۔ جس نے معلمین کی حقیقی قدر و منزلت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

آج کے دور میں زبان پڑھانے کے سلسلے میں لسانیات بہت مددگار ثابت ہو رہی ہے لیکن افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ ابھی اردو والوں نے اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھایا ہے۔ ابھی تک زبان کو مجموعۂ الفاظ ہی سمجھا جا رہا ہے۔ بہرحال ثانوی زبان کی حیثیت سے اُردو پڑھاتے وقت جو مشکلات مجھے پیش آگئی ہیں۔ ان کو اِن مضامین میں پیش کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی اُن کے حل بھی تجویز کیے ہیں اور جگہ جگہ پر لسانی اصولوں سے مدد بھی لی ہے۔ جہاں بھی خالی زبان کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں در اصل میری مُراد اردو سے ہے۔

آج کل اُردو اسکولوں اور کالجوں سے تو تقریباً غائب ہی ہے لیکن پھر بھی تعلیم یافتہ طبقے میں اِس زبان کو سیکھنے کا شوق دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے اور میں اسی طرح کا ایک کورس یہاں پنجاب یونیورسٹی چنڈیگڑھ میں پڑھا رہا ہوں جس میں ہر سال پچاس سے زیادہ طالب علم اردو سیکھتے ہیں۔ اِس لیے میں نے اپنے مشاہدے اور اُن مسائل کو جو غیر اردو داں حضرات کو اردو پڑھاتے وقت پیش آتے ہیں۔ ان مضامین میں پیش کیا ہے ساتھ ہی ان کے حل اور تراکیب بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے اِن مضامین سے وہ تمام طلبہ اور اساتذہ استفادہ حاصل کریں گے جو ثانوی زبان کی حیثیت سے اُردو کی درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔

کیونکہ مادری زبان کی تعلیم اور ثانوی زبان کی تعلیم میں بہت فرق

ہے اور ان کے مسائل بھی مختلف ہیں۔ اِن دونوں کا نصاب بھی الگ الگ ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے مسائل جیسے درسی کتابوں کی فراہمی۔ ادب اور معاشرت تعلیم کے منصوبے۔ آج کی تعلیمی حالت۔ نظام تعلیم میں سدھار کی ضرورت اُردو کی زبوں حالی اور مستقبل کے بارے میں مضامین ترتیب دے کر میں نے ان سارے مسائل کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو ثانوی زبان کی تعلیم کے دوران پیش آتے ہیں۔

یہ تمام مسائل ایسے ہیں جن پر بہت کم توجہ دی گئی ہے اور ابھی تک کوئی باقاعدہ کتاب اس موضوع پر سامنے نہیں آئی ہے۔ اس حقیر سی کوشش میں، میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا انحصار تو قارئین پھر ہے جس کا فیصلہ وہ کتاب پڑھ کر ہی کر سکیں گے۔

میں محترم چچا جان (جناب ابراھیم یوسف) جناب محمد جمال صاحب رفاد فتحی صاحب یو، ٹی، آر، اسی۔ سولن کا بہت ممنون ہوں، جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور مواد کی فراہمی میں مدد بھی کی۔

"اردو کی درس و تدریس کے مسائل" سے متعلق مخلصانہ رائیں اور مشورے میرے لیے شکریہ کے باعث ہونگے۔ ممکن ہے کہ میں آپ کی روشنی میں کوئی اور بہتر کتاب لکھ سکوں۔

ہارون ایوب ۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۸۱ء

صدر شعبۂ اُردو۔ پنجاب یونیورسٹی۔ چنڈیگڑھ۔ 160014

زبان اور اُس کا ادبی سرمایہ

"زبان فکر اور اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے" ـــــ زبان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ فکر یا انسانی خیالات زبان کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز کی قدر و قیمت اور اہمیت اس وقت ہوتی ہے جب اس چیز سے متعلق الفاظ ذہن میں جمع ہو جاتے ہیں اور پھر ان جمع الفاظ کے اظہار ہی سے دوسرے لوگ جان پاتے ہیں کہ اس چیز کی کیا اہمیت ہے۔ اس کا دوسری چیزوں سے کیا رشتہ ہے یہ سب الفاظ کے بغیر ممکن نہیں ـــــ انسان کا طرۂ امتیاز اُس کی زبان اور قوت گویائی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے جذبات و خیالات، تجربات اور مشاہدات کو محفوظ کرتا ہے اور دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

زبان ایک نظام ہے جس کے چند اصول ہیں۔ محض الفاظ کو یکجا کرنے کا نام زبان نہیں ہے بلکہ ان الفاظ کو ایک خاص ترتیب اور قواعد کے لحاظ سے یکجا کر کے بولنے کا نام زبان ہے ـــــ مثال کے طور پر

کسی بھی ایک چھوٹے سے جملے کو لے لیجئے "احمد اسکول گیا"
جملہ جس میں صرف تین الفاظ ہیں، اُن کی یہی ترتیب اہم ہے۔
اگر انہیں الٹ پلٹ کر دیا جائے تو مطلب تو نکل آئے گا لیکن
جملہ اور زبان کے حسن اور ترتیب دونوں کو چوٹ پہنچائے گا۔
اس کے علاوہ اور بہت سے جملے ایسے ہیں جن کی ترتیب بدل دینے
سے نہ صرف مطلب نکلتا ہے بلکہ جملے کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔
مثلاً احمد کو کتے نے کاٹا۔ اگر ذرا اس کی ترتیب بدل دی جائے تو
لوگ یہ سمجھیں گے کہ احمد نے کتے کو کاٹا۔ سب زبان کی ترتیب بہت ضروری ہے۔

زبان کی ترقی کے سلسلے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ زبان
زندہ اور جاندار ہے جو وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اپنے خزانے
میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔ یعنی نئے الفاظ اس میں آتے ہیں اور کچھ
نہ کچھ الفاظ کا چلن ختم ہو جاتا ہے اور الفاظ متروک قرار دے کر
چلن سے ہٹا دیئے جاتے ہیں۔ اردو اس بات پر پوری اترتی ہے
اس نے وقت کا برابر ساتھ دیا ہے۔ اور برابر نئے الفاظ اس
میں داخل ہو رہے ہیں۔

زبان کسی گروہ یا قوم کی نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے ماحول
اور آب و ہوا اور تہذیبی روایات کے ذریعہ پھیلتی اور ترقی کرتی
ہے۔ یہ سارے حالات ہر علاقے کے جدا جدا ہوتے ہیں۔ ہر دس
یا ۱۵ میل کے فاصلے پر زبان میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آجاتی ہے۔

اور جوں جوں یہ فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا ہے زبان کا اختلاف نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن بدلتی ہوئی زبانوں میں ضرور کوئی نہ کوئی زبان ایسی ہوتی ہے جو دونوں میں رابطہ کا کام کرتی ہے جسے سب بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں آزادی سے پہلے یہ فخر اردو کو حاصل تھا لیکن آج یہ جگہ اردو کے بجائے انگریزی نے حاصل کر لی ہے۔

دنیا کے ہر بڑے ادیب نے اپنے وقت کی نمائندگی اپنے بہترین ادب پاروں کے ذریعہ کی ہے اور ان ادب پاروں کے مطالعے سے ہم اس وقت کی تہذیبی اور ادبی زندگی اور اس دور کے رموز و اشارات کو سمجھ سکتے ہیں الغرض جیسے جیسے زمانہ کی راہیں بدلتی ہیں اسی رفتار سے زبان میں بھی تبدیلی آتی ہے۔

اس بات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر زمانے کا ادب خواہ وہ فلسفہ ہو یا شاعری یا سائنس اپنے زمانے کے سماج کی فکری کاوشوں کا اظہار کرتا ہے اور یہ پورا ادبی سرمایہ زبان کا مرہونِ منت ہے

زبان ایک جائزہ

زبان کے سلسلے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ اسے خُدا نے پیدا کیا ہے لیکن لسانیات کے ماہرین نے اسے ثابت کر دیا ہے۔ کہ انسان نے زبان خود بنائی ہے۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ انسان اپنے جذبات کا اظہار مختلف آوازوں سے کرتا ہے اور یہی آوازیں آگے چل کر الفاظ بن جاتی ہیں اور پھر کئی الفاظ جملہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے بقول عبدالقادر سروری نے

"زبان اُن ملفوظ آوازوں کا مجموعہ ہے جن کو ہم اپنی ضرورت کے موافق قصداً ادا کرتے ہیں۔"

الغرض آدمی جو کچھ بولتا ہے وہی زبان ہوتی ہے اس لیے زبان کا تعلق آدمی کے جذبات، تاثرات، اس کے مذہب اور قومیت سے ہوتا ہے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ بولتا ہے اگر اسے خدا نے بولنے کی طاقت دی ہے تو۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل۔ بچہ ہو یا بڈھا۔ آدمی ہو یا عورت جب وہ بولتا ہے

تو منہ سے کئی طرح کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں جن کا مطلب ہم
ہمارے تہذیبی روایات اور سماجی ماحول سے حاصل کرکے سمجھ
لیتے ہیں۔

مختلف آوازیں مل کر الفاظ بناتی ہیں اور پھر کئی الفاظ مل
کر جملے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ جملے جس ماحول اور واقعہ
کے سلسلے میں کہے جاتے ہیں اسی اعتبار سے معنی دیتے ہیں۔

اس سارے تسلسل کو ہم زبان کا نام دیتے ہیں۔

ہر زبان میں اس کے بولنے والوں کی وجہ سے کچھ نہ کچھ تبدیلیاں
ضرور آتی ہیں کیونکہ ہر آدمی کا اندازِ گفتگو جدا جدا ہوتا ہے ایک
آدمی کے بولنے کے انداز کو ideoclect کہتے ہیں اور ایک
گروہ کی بولی کو Dialect کہتے ہیں۔ اور جب کئی گروہ ایک بولی کو
بولیں تو اسے Language یا زبان کہتے ہیں۔

زبان میں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان کا سبب، ماحول، جغرافیائی
حالات، سماجی حالات وغیرہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا
ہے کہ دو مختلف زبانوں کے بولنے والے تجارت یا کسی دوسری
وجہ سے دو زبانوں کو ملا کر ایک تیسری زبان بنا لیتے ہیں اپنا کام
چلانے کے لیے اسے Pidgin کہتے ہیں اور جب یہی زبان ان
دونوں قوموں کے بیچ پل بڑھ کر تعلیم، انتظامیہ، شعر و ادب
کے لائق ہو جاتی ہے اور دیگر معاملات کو اسی زبان کے ذریعہ حل

کرنے کے قابل سمجھا جانے لگتا ہے تو اسے ba o ne a c کہتے ہیں۔ اردو ایسی ہی ایک زبان ہے جو دو زبانوں سے نہیں بلکہ کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے۔

زبان کے سلسلے میں یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ خدا نے جب آدم کو دُنیا میں بھیجا تو اس کے سامنے مختلف چیزیں پیش کیں کہ وہ ان کے نام تجویز کر لے اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہوا کہ جو نام آدم تجویز کریں گے وہ ہی قیامت تک جاری رہیں گے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چیز کے کئی کئی نام موجود ہیں۔ یعنی اس چیز کو مختلف زبانوں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے اس کی صاف وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان جو جہاں رہتا ہے اس نے وہاں کے ماحول اور آب و ہوا کی مناسبت سے اپنے سامنے والی چیزوں کے نام تجویز کر لیے اور وہ اسی طرح سے رائج ہو گئے۔

زبان کی یہ بھی عجیب و غریب خصوصیت رہی ہے کہ اس کے وجود میں آنے کے بعد جب بھی کسی زبان کے ادب کے لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو نظم سے شروع ہوا ہے حالانکہ نثر دن رات بولتے ہیں لیکن جب اپنے خیالات کو جامعہ شکل میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو الفاظ کو بھی مربوط کر لیا گیا اور نثر کے بجائے نظم میں اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا۔ اسی طرح جب زبان وجود میں آئی ۔ الفاظ اور جملوں سے پہلے راگ پیدا ہوا

کیونکہ انسان نے اپنی خوشی کا اظہار گا کر کیا۔ یہی راگ اور اس کے اتار چڑھاؤ دھیرے دھیرے الفاظ کی شکل اختیار کرتے گئے۔ اور زبان وجود میں آ گئی ۔ اگر غور سے دیکھیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی کی تاریخ کے ایک بہت بڑے زمانے پر زبان کی ابتدائی تاریخ پھیلی پڑی ہے کس طرح انسان نے الفاظ بنائے اور پھر انہیں جوڑ کر بولنا شروع کیا تا کہ وہ اپنا مقصد دوسروں پر ظاہر کر سکے۔

یہ خاص بات ہے کہ انسان نے ابتدا سے جس کا نام جو تجویز کیا اس میں اس کا عکس ضرور موجود تھا۔ اور وہی عکس انسان کو اس کے معنی سمجھنے میں مدد دینے لگا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ایک ملک یا ایک گروہ کے لوگوں نے کسی ایک چیز کے لیے جس الفاظ کا استعمال کیا دوسرے ملک کے لوگوں نے اس چیز کو دوسرے نام سے پکارا یہ سب اس لیے ہوا کہ انہوں نے جو بھی نام تجویز کیے ان پر دیسی کے تمدنی اثرات ۔ ماحول اور آب وہوا کے اثرات شامل تھے۔ اس کے علاوہ اپنی ضروریات اور لیاقت سے مختلف الفاظ بھی بنائے لیکن جب انسانی تہذیب نے ترقی کی طرف اپنے قدم بڑھائے یعنی قبیلے کی زندگی ختم ہونا شروع ہوئی اور دو یا تین قبیلوں نے مل کر ایک نئی تہذیب کا آغاز کیا تو ان کی بولیوں سے ایک ملی جلی زبان وجود میں آئی ۔ اور ہر ایک چیز کے لیے ایک سے

زیادہ الفاظ چلن میں آ گئے۔ لیکن جو قبیلہ اس وقت طاقت ور تھا اس کی زبان کے الفاظ نے دوسرے الفاظوں کو خارج کر دیا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا کہ وہ الفاظ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے ہوں۔ بس ان کا چلن کم ہو گیا۔ ان سب الفاظ نے مل کر انسان کے الفاظ کے خزانے کو مالا مال کر دیا۔ اور اس کے پاس ایک چیز کے لیے کئی کئی الفاظ ہو گئے جس سے اظہار خیال میں بہت مدد ملی۔ خاص طور پر جب ادب و شاعری کا چلن شروع ہوا تو شعرا حضرات نے اپنی لیاقت کی بنا پر نئے الفاظ استعمال کر کے ایسے الفاظوں کو بھی زندہ کر دیا جو صرف لغت کی زینت بنے ہوئے تھے۔

ہر زبان کی لغت اپنی جگہ بہت اہم ہوتی ہے کیونکہ سارے الفاظ اس میں جمع ہوتے ہیں جو اس زبان کے بولنے اور لکھنے والے استعمال کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے الفاظ متروک ہو جاتے ہیں لیکن وہ لغت کا حصہ ضرور رہتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس زبان میں جتنے زیادہ الفاظ ہونگے وہ زبان اتنی ہی امیر ہوگی۔

جس طرح لفظوں سے پہلے راگ انسان نے بنائے ٹھیک اسی طرح جملوں سے پہلے اس کی تصویر اور تصور وجود میں آیا اور اس کی بہترین مثال چینی زبان ہے جس میں آج بھی کسی خیال یا بات کے لیے ایک مکمل تصویر موجود ہے لیکن دوسری زبانوں نے اپنے تصور کو جملوں

کی شکل میں تبدیل کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ اسے مختصر بھی کیا، جس کا
سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایک لفظ کئی جگہ استعمال ہونے لگا۔ اور حروف
تہجی بھی کم ہو گئے۔۔۔ یہ اس زبان کے بولنے والوں کے مہذب ہونے
کی علامت ہے کیونکہ جوں جوں انسان نے ترقی کی اس کے تہذیب و
تمدن کا معیار بلند ہوا اس کی زبان نے بھی ترقی کی منزلیں طے کیں
اور مختصر اور جامع شکل بنتی گئی۔۔۔ اس کی دوسری شکل یہ بھی ہے
جو قومیں جتنی وحشی ہیں وہ اتنی ہی زیادہ آوازیں استعمال کرتی ہیں
حالانکہ یہ بات آج کے زمانے میں کچھ درست نہیں معلوم ہوتی ہے۔ تو
قومیں مہذب ہو گئی ہیں لیکن زبان نے اپنا جو ایک ڈھنگ اختیار کر لیا
تھا آج بھی اسی پر عمل کیا جاتا ہے چاہے وہ چینی زبان ہو یا کسی
وحشی قوم کی کوئی زبان۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ جب آمد و رفت کا سلسلہ بڑھا اور لوگ
ایک ملک سے دوسرے ملک گئے تو ایک دونوں زبانوں کا اثر ایک
دوسرے پر پڑا۔ اور بہت سے الفاظ ایک زبان کے دوسری
زبان میں اس طرح سے رچ بس گئے کہ وہ اسی زبان کا ایک حصّہ
ہو گئے ہیں لیکن بعض الفاظ اپنی مخصوص آوازوں کی بنا پر ہضم نہ ہو سکے
اور انہیں جب دوسری زبان نے اختیار کیا تو کچھ تبدیلی کر کے اختیار کر لیا۔
کیونکہ اصل میں وہ آوازیں اس زبان میں موجود نہیں تھیں مثال کے طور پر
ہندی کا لفظ دیش جب اردو والوں نے اپنایا تو اسے دلیس کی شکل

میں اختیار کیا۔ اسی طرح سے عربی اور فارسی حروف مثلاً۔ ث، خ،
ص ض، ط ظ اور ع غ اردو میں داخل تو ہو گئے ہیں اور لکھنے میں ان
کا چلن بھی ہے لیکن عام طور پر ہندوستانی زبانوں کے اثر کی بنا
پر بولے نہیں جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں لسانیات کے ماہرین کا یہ بھی خیال
ہے کہ ہم آواز حروف میں سے صرف وہی حرف زندہ رہتا ہے اور چلن
میں رہتا ہے جو ملک اور قوم کی مادری زبان کا لفظ ہوتا ہے۔ لیکن
اردو میں ایسا کچھ نہیں ہے اردو ان بہت سے اصولوں کو توڑتی ہے۔
مثلاً۔ کچھ ہندوستانی زبانوں میں استعمال ہونے والا حرف ہے اور خ
اس کی جگہ پر ایران سے آیا۔ لیکن اردو والوں نے دونوں کو اپنایا اور دونوں
کا چلن اپنی اپنی جگہ پر مکمل اور صحیح ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو دو مختلف
تہذیبوں کے ملنے سے پیدا ہوئی ہے اس لیے اس میں سب طرح کے
الفاظ کا چلن موجود ہے جو دوسری زبانوں میں بولے جاتے ہیں۔

زبان اور اس کے حروفِ تہجی کی ایک اور خصوصیت ماہرِ لسانیات
بتاتے ہیں کہ وہ قلم اٹھائے بغیر لکھے جا سکیں تو اردو زبان اس بات پر
پوری اترتی ہے بلکہ حروف مختصر شکلوں میں لکھے جاتے ہیں جس کی وجہ سے
یہ زبان اور بھی مختصر ہو گئی ہے اور یہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں تیزی سے
لکھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں آج تک شارٹ ہینڈ رائج نہیں
ہو سکا ہے۔

لسانیات کی اہمیت

لسانیات وہ علم ہے جس کے تحت ہم زبان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے آخر ضرورت کیا ہے کسی زبان کے مطالعہ کی۔ زبان کی تو یہ خوبی ہے کہ ہم جو کچھ بولتے ہیں دوسرا اسے سمجھتا ہے ہم جو کچھ لکھتے ہیں زبان کا جاننے والا اسے پڑھتا ہے اور سمجھتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ پھر بھی لسانیات کے ذریعہ ہم زبان کی خوبیاں اور خامیاں پرکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ زبان کیسے بنی۔ اس کے وجود میں آنے کے کیا اسباب تھے۔ کیوں اس زبان کا چلن عام ہوا۔ زبان میں کس کس زبان کے الفاظ داخل ہوئے اور کیسے رچ بس کر اس زبان کا حصّہ بن گئے۔ زبان ایک ہی ہے لیکن ایک شخص کے بولنے سے دوسرے شخص کا انداز کیوں جُدا ہے۔ ہم کسی زبان کو کب زبان کا درجہ دیتے ہیں اور کب اسے بولی کہتے ہیں۔ زبان کس طرح سے ہمارے معاشرے کو متاثر کرتی ہے۔ زبان کا مزاج کیا ہے۔ ایک زبان کا دوسری زبان سے کیا تعلق ہے۔ کیوں ہم کسی زبان کو مادری زبان

یا پہلی زبان کہتے ہیں۔ کسی زبان کو ہم ثانوی زبان کا درجہ کب دیتے ہیں اور کیوں۔؟ وغیرہ وغیرہ جیسے لاتعداد مسائل ہیں جن کا ہم مطالعہ لسانیات کے تحت کرتے ہیں۔

لسانیات کے مطالعے کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے۔ ہم اس کے اصولوں کے تحت زبان کو درست کر سکتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ہر عمر میں جاری رہتا ہے۔ اس کی مثال ایک بچے سے لی جا سکتی ہے۔ ایک بچہ جو کچھ بھی بولتا ہے وہ اپنے معاشرے سے سیکھتا ہے لیکن بعض اوقات اُس کا تلفظ یا وہ ابھی غلط انداز سے جملے یا الفاظ ادا کرتا ہے۔ آپ اسے فوراً ٹھیک کر دیتے ہیں۔ اور تھوڑے دن کی محنت کے بعد بچّہ صحیح انداز سے بولنے لگتا ہے اسی طرح سے زبان کی بہت سی غلطیوں کو لسانیات کے ذریعہ درست کیا جاتا ہے تاکہ زبان سیکھنے والے اور بولنے والے اُن کو سمجھ کر صحیح انداز سے بول سکیں۔ وجہ یہ ہے کہ آپ زبان بچپن سے بول رہے ہیں لیکن کسی نے آپ کو ٹوکا نہیں تو وہی غلط انداز اختیار کیے رہیں گے جب تک کوئی آپ کی اس غلطی کو درست نہیں کر دیتا ہے۔ لسانیات اس غلطی کی وجہ بھی بتاتا ہے اور جب وجہ آپ کی سمجھ میں آجائے گی تو جہاں آپ کو غلطی کا احساس ہوگا وہاں لسانیات کی اہمیت اور اس کے صحیح استعمال پر آپ کی نظر جائے گی۔ بس یہی کام ہے

علم لسانیات کا۔
جب دو شخص آپس میں اردو میں بات چیت کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی باتوں کا مطلب سمجھ رہے ہیں اور وہ جو الفاظ بولے جا رہے ہیں ان کے ذخیرے سے واقف ہیں۔ جملوں کی ساخت سے بھی واقف ہیں تب ہی تو وہ ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھی لسانیات کا اہم موضوع ہے کہ زبان جب ترقی کرتی ہے۔ تو اس میں نئے نئے الفاظ داخل ہوتے ہیں تو کچھ الفاظ کا چلن خود بہ خود ختم ہو جاتا ہے اس طرح کے بہت سے مسائل ہیں جو ایک زبان کے جاننے والوں کو درپیش آتے ہیں وہ السانیات کے مطالعے سے ہی حل کیے جاتے ہیں اور جب بھی کسی زبان کے سلسلے میں کوئی مثال دینا ہوتی ہے کہ جملہ ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس طرح ٹھیک ہے تو اس کی مثال میں ہمیں کسی نہ کسی بڑے ادیب یا شاعر کا جملہ یا مصرع پیش کرنا پڑتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب سے مثالیں لی جا سکتی ہیں اسطرح لسانیات کے مطالعے میں ادب کو بھی دخل حاصل ہے اور اس کی مدد سے ہم زبان کی اصلاح کر سکتے ہیں۔
لسانیات ثانوی زبان کی حیثیت سے کسی بھی زبان کو سیکھانے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے کیونکہ جو اصول

اس علم نے بتائے ہیں، وہ کچھ اتنے دلچسپ اور آسان ہیں کہ
ان پر عمل کرکے کوئی بھی شخص زیادہ آسانی سے نئی زبان سیکھ
سکتا ہے۔ لیکن اِس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ جو بھی زبان ثانوی
زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے وہ ادبی زبان ہونا چاہئے۔
جس کو ایک بہت بڑا مہذب گروپ بولتا ہو اس میں ہم گاؤں
کی بولی، یا کسی چھوٹی زبان کو نہیں پڑھا سکتے ہیں اس لیے وہ بولی
جس زبان کی بھی شاخ ہوتی ہے اُسے اُس مادری زبان کا
جاننے والا تو آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ لیکن ایک نیا شخص جس نے
ابھی ابھی وہ زبان سیکھی ہے وہ نہیں سمجھ پاتا ہے۔ اِس لیے
کہا جاتا ہے کہ جو بولی جاتی ہے لکھی جاتی ہے اس میں بہت فرق
ہوتا ہے اس کی بہترین مثال خود اردو بھی ہے کیونکہ جس اردو
کو ہم روزمرہ کی زبان کے طور پر بولتے ہیں اس میں ہم لاتعداد ہندی
اور انگریزی کے الفاظ اپنی بات چیت کے دوران استعمال کرتے ہیں
لیکن جب اِسی زبان کو لکھتے ہیں تو بلا ضرورت ہم انگریزی یا کسی
دوسری زبان کے الفاظ استعمال نہیں کرتے ہیں۔
زبان کو سکھانے میں لاتعداد مسائل سامنے آتے ہیں اور اُن
میں تلفظ کا بھی ایک اہم مسئلہ ہے اور لسانیات نے اس سلسلے
میں لاتعداد اصول وضع کیے ہیں اور ان پر بہت کام ہوا ہے جس
سے تلفظ کی ادائیگی میں بہت مدد ملتی ہے۔

الغرض لسانیات زبان کے مسائل اور خاص طور پہ ثانوی زبان کے مسائل ملکی اور غیر ملکی لوگوں کے زبان سیکھنے کے مسائل کے حل پیش کرتا ہے۔ اور وہ اصول بتاتا ہے جس سے زبان آسانی سے سیکھی جا سکے۔ یہی کچھ لسانیات کا اصل موضوع ہے۔

"زبان پڑھانے کے مقاصد"

زبان کو بہتر ڈھنگ سے پڑھانے کے ضرور ضروری ہے۔ کہ مدرس چند مخصوص مقاصد کو اپنے ذہن میں رکھے۔ کیونکہ بے مقصد کوئی بھی چیز کسی نتیجہ پر نہیں پہنچنے دیتی ہے۔ اور ساری محنت بے کار ہو جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مقاصد کو سامنے رکھ کر طالب علموں کو زبان پڑھائی جائے تو اس میں "یقیناً" کامیابی حاصل ہو گی۔ پہلی چیز اس سلسلے کی یہ ہے کہ طالب علم کیوں زبان سیکھ رہا ہے۔ اس طرح کے سوالات قائم کر کے ہمیں اپنے مقاصد کا تعین کرنا چاہیئے۔ تاکہ زبان کو ان ضروریات کے مطابق ڈھال کر پڑھایا جا سکے۔ زبان کے طور طریق، اسلوب اور گفتگو کے دوران تہذیبی باتوں کو خیال میں رکھ کر پڑھایا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ خود مدرس کو زبان پر پورا عبور حاصل ہو اور وہ زبان کی

باریکیوں سے واقف ہو۔ اور ان باریکیوں کو واضح کرنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر رکھتا ہو۔ عام طور پر زبان پڑھانے کے چند مقاصد دورِ جدید کے چند محققین نے بتائے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ زبان سیکھنے والا الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کر سکے۔
۲۔ گفتگو کے دوران آداب گفتگو کا خاص طور پر خیال رکھ سکے۔
۳۔ روانی سے بول اور پڑھ سکے۔
۴۔ جملے کو سن کر سمجھ سکے۔
۵۔ اور پھر اس پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔
۶۔ زبان کے اسلوب کو سمجھ سکے۔
۷۔ آسان جملوں میں وہ اپنی بات کی وضاحت کر سکے۔

بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۔ زبان سیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ طالب علم نہ صرف اہلِ زبان کی بات چیت سمجھ سکے بلکہ زبان کی مخصوص آوازوں کو پیدا کرنے اور ان سے بننے والے الفاظ کو ترتیب دینے اور جملوں میں اس طرح پیش کرنے پر بھی قادر ہو کہ اہل زبان اس کے مفہوم کو پوری طرح سے سمجھ لیں۔[۱۱]

"ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھانے کا طریقۂ کار"

یہاں طریقۂ کار سے میری مراد ایک ترتیب یا پلان سے ہے جس کے تحت اردو زبان کے تمام اجزاء کو تسلسل سے پیش کرنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ طالب علموں کی ضرورت اور صلاحیت کو بھی مد نظر رکھنا ہے۔ اس طرح ہمیں ایک نہیں کئی طریقے اپنے طالب علموں کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے بنانا ہونگے اور ان کو برتنا ہوں گے، اُن کی ضروریات، مزاج و مذاق کے مطابق ــــــ

مثلاً اگر ہم ہندی بولنے والے طالب علموں کو اردو پڑھائیں گے تو جو طریقۂ کار اختیار کریں گے وہ مدراسی، بنگالی یا کسی غیر ملکی طالب علم کو اردو پڑھاتے وقت اختیار نہیں کریں گے، کیونکہ اُن کی مادری زبان کا اندازہ ہماری زبان سے بالکل ہی مختلف ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم انگریزی زبان کا سہارا لیں۔ یہ

حضرات بہت سی اردو کی آوازوں کو بھی آسانی سے ادا نہیں کر پائیں گے۔ ایسی صورت میں ہمارے اساتذہ کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اُن کے ساتھ زیادہ محنت کریں اور ان آوازوں کو بار بار دہرواکر، تو کبھی ٹیپ رکاڈ کی مدد سے ذہن نشین کرائیں۔

حرُوف تہجی کے بعد اضافت اسم اور اس کی مختلف حالتوں کو تفصیل سے سمجھائیں جبکہ ہندی بولنے والے طلبہ کے ساتھ اتنی محنت کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی گرامر پر بہت زور دینے کی ضرورت ہے۔

ہندی بولنے والے طلبہ کے سلسلے میں ہمیں کسی دوسری زبان کی مدد کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی ہے، وہ تو حرُوف تہجی سیکھنے کے بعد آسانی سے اردو لکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔

ایسے طالب علموں کے لیے جملوں کی ساخت کے سلسلے میں بھی محنت کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی جبکہ غیر ہندی داں طلبہ کے ساتھ جملوں کی بناوٹ پر خاص توجہ دلانے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ اِس کے بغیر ایک معمولی سا جملہ بھی نہیں بول سکیں گے۔۔۔

اس طرح دونوں کے لیے ہمیں مختلف طریقہ کار اپنانا ہوں گے۔

ثانوی زبان کی حیثیت سے جب اُردو پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو دوسرا اہم سوال ہمارے سامنے طالب علموں کی عمر کا آتا ہے۔ جو ایک بہت اہم سوال ہے۔ جو طالب علم جتنا زیادہ بڑا ہوگا میری مراد یہاں بالغ اور تعلیم یافتہ طالب علموں سے ہے تو اُن ذاتی

ہی زیادہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے یعنی وہ چھوٹی عمر کے
طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے کسی بھی بات کو سمجھ لیں گے۔
چھوٹی عمر کے طالب علموں میں لاپرواہی کا عنصر اکثر پایا جاتا ہے جس
کی وجہ سے وہ بہت سے اہم نکات سے ناواقف رہ جاتے ہیں جبکہ
بالغ طالب علم سنجیدہ ہوتے ہیں اور ہر بات کو غور سے سنتے اور سمجھتے
ہیں۔ ایسی صورت میں کسی بھی بات کو ایک بار بتا دینا کافی ہوتا ہے
جبکہ چھوٹی عمر کے طالب علموں کے سلسلے میں سخت محنت اور زیادہ
تحریری کاموں پہ عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اردو ہو یا کوئی اور زبان الغرض تہذیب سے اس کا گہرا تعلق
ہوتا ہے اور کسی بھی زبان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے تہذیبی
پس منظر میں اسے دیکھا جائے، اس لیے طالب علموں کو اردو
پڑھانے کے ساتھ ساتھ تہذیبی ماحول سے واقفیت کرانا بھی بہت
ضروری ہے۔ بالغ طالب علم تو اس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی
لیتے ہیں لیکن چھوٹی عمر کے طالب علم اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں
دیتے ہیں پھر بھی استاد کا فرض ہے کہ وہ بہت کچھ انہیں بتائے اور
بار بار بتائے۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اردو زبان کی زندگی اور ترقی
کا مسئلہ صرف رسم الخط کے تحفظ کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ تہذیب اور
شائستہ انداز میں گفتگو کرنے کا بھی ہے لطیف اور شائستہ انداز
میں گفتگو کرنے والے گھرانوں کی تعداد بہت محدود ہوتی جا رہی ہے۔

وہ گھبرائے اس انداز میں گفتگو کرتے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی مرحلے پر اردو زبان و ادب سے ہے یہ شائستگی اور تہذیب جو صدیوں کے میل ملاپ کا نتیجہ ہے ہمارے لیے تہذیبی ورثہ ہے۔ اس سے واقفیت ہمارے طالب علموں کے لیے بہت ضروری ہے۔

ان سب چیزوں کو پڑھانے کے دوران اگر کسی وقت استاد یہ محسوس کرے کہ طالب علم اکتاہٹ محسوس کر رہے ہیں تو اسے فوراً اپنے طریقۂ کار کو بدل دینا چاہیے اور شعر و شاعری کا سہارا لے لینا چاہیے۔ انہیں اچھے، خوبصورت اور بامعنی اشعار سنانے اور سمجھانے چاہیے تاکہ ان کی دلچسپی اور شوق کو برقرار رکھا جا سکے۔ ایسی صورت میں جبکہ وہ بہت زیادہ اکتا جائیں تو کلاس بھی ختم کر دینا چاہیے اور دوسرے دن بات کرنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے دوسرے دن پھر نئے سرے سے بات کرنا اور پڑھانا چاہیے۔

استاد کا یہاں فرض ہے کہ ایسے طریقہ کار استعمال کرے کہ طالب علم اکتاہٹ محسوس نہ کریں اس لیے ابتدا میں زیادہ کام نہیں دینا چاہیے اور ایک دن میں ۵ سے زیادہ حروف تہجی نہیں بتانا چاہیے۔ اس میں وقت چاہیے زیادہ لگ جائے لیکن انہیں اکتاہٹ سے بچانا چاہیے۔

حروف تہجی اور جملوں کی ساخت سکھا دینے کا نام اردو پڑھا دینا نہیں ہے۔ اس کے بعد ادبی نظموں اور نثری حصوں کا

پڑھانا بھی بہت ضروری ہے تاکہ ان میں روانی سے پڑھنے اور سمجھنے کی عادت پیدا ہو جائے ان اسباق کا تعین کرنا بھی ہمارے اساتذہ کے طریقہ کار کا ایک اہم جزو ہے ۔ ۔ ۔ وہ اپنے طالب علموں کو ان کے مزاج اور مذاق کے مطابق اسباق پڑھنے کو دیں ، جس سے ان کی دلچسپی برقرار رہے ۔ بالغوں کو بچوں کی نظمیں یا اسباق پڑھنے کو نہ دیں ۔ مانا کہ وہ آسان ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں گہرائی اور معنویت کم ہوتی ہے جو بالغان کے مزاج کو تسکین نہیں دے پاتیں اس سے وہ گھبرا کر کلاس سے بھاگنے لگتے ہیں ۔

اکثر کلاس میں ٹیپ ریکارڈ کی مدد لیجیے یعنی کسی ایسی غزل کا انتخاب کیجیے جو کسی مشہور گانے والے کی گائی ہوئی ہو ۔ وہ انہیں کلاس میں سنائیے اور ان سے پوچھیے کہ انہیں کیسی لگی وہ کس حد تک اسے سمجھ سکے پھر اسی غزل کو پڑھائیے یعنی ایک ایک لفظ معنی بتانے کے ساتھ ساتھ اس کے ہر شعر کی تشریح کیجیے جب وہ پوری طرح سے سمجھ جائیں اور مطمئن ہو جائیں تب انہیں پھر وہ ٹیپ شدہ غزل سنائیے ۔ اب یقیناً وہ اس غزل کو سن کر زیادہ خوش ہونگے اور دلچسپی لیں گے ۔

اسی طرح بہت سی غزلیں شعرا کی آواز میں بھی ٹیپ کر کے رکھ لینا چاہیئے اور وہ بھی وقتاً فوقتاً انہیں سناتے رہنا چاہیئے اور پھر انہیں پڑھائیے بھی ۔

اسی طرح تلفظ کے سلسلے میں بھی ٹیپ رکارڈ وغیرہ کی مدد لینا چاہیئے۔ آوازوں کو بول کر بتانے کے علاوہ زبان، ہونٹ، تالو اور دانتوں وغیرہ کی مختلف حالتوں کے چارٹ سے بھی سمجھانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

ہم اردو والے تلفظ سکھانے کے سلسلے میں ابھی بہت پیچھے ہیں جبکہ غیر ممالک نے اس سلسلے میں خاصی ترقی کی ہے انہوں نے مختلف قسم کی مشینیں بھی ایجاد کر لی ہیں ہمارے پاس لے دے کر صرف استاد ہی وہ ذریعہ ہے جو سب کچھ کر سکتا ہے اس لیے اسے ہمت اور لگن سے اپنے فرض کو پورا کرنا چاہیئے تب ہی جاکر دوسری زبانیں جاننے والے اُردو سیکھ سکیں گے۔

اس لیے اردو کے اساتذہ سے درخواست کروں گا کہ انہیں بودل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے اور ٹیپ رکارڈ جیسی کچھ سہولیات اگر انہیں میسّر ہیں تو انہیں ضرور استعمال کرنا چاہیئے تاکہ اپنے طریقۂ کار کو وہ دلچسپ اور طالب علموں کے مذاق اور مزاج کے مطابق بنا سکیں جو استاد اس میں جتنا زندہ کامیاب ہو گا وہ اتنے ہی زیادہ طالب علموں کو اردو پڑھا سکے گا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کردوں کہ طالب علموں میں بھی اردو سیکھنے کا شوق ہو گا تب ہی ہمارے اساتذہ کی محنت

رنگ لائے گی لیکن پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اُن کے شوق کو بڑھانے میں اُن کی دلچسپی کو قائم رکھنے میں استاد کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

ہندی داں حضرات کو اُردو پڑھانے کے مسائل

آپ سب بخوبی واقف ہیں کہ باہمی میل جول کے نتیجہ میں جس زبان نے آج سے چار سو سال پہلے فوجی کیمپوں اور بازاروں میں جنم لیا تھا وہ آج کی اُردو ہے۔ جس کے سبب مختلف تہذیبیں ایک دوسرے کے قریب آسکیں یہ نکھری اور صاف ستھری زبان برج بھاشا، کھڑی بولی، پنجابی، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اشتراک سے بنا ہے جس نے ہمیشہ وقت کے بدلتے دھارے کا ساتھ دیا ہے اور مغربی زبانوں کے الفاظ سے بھی استفادہ اٹھایا، جس میں انگریزی زبان کا حصہ نمایاں ہے کیونکہ اردو زبان نے اپنی ضرورت کے مطابق ایسے تمام الفاظ کو اپنے اندر جذب کر لیا جس کی اس کو ضرورت تھی۔

یہ زبان جو ہماری اپنی زبان ہے، جس نے ہندوستان کی سرزمین پر جنم لیا ہے، جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی جاتی ہے، جو کسی ایک مخصوص خطہ یا طبقہ کی میراث نہیں ہے بلکہ ہندؤں اور مسلمانوں کے باہمی ربط و اشتراک کی نشانی ہے جسے بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستان کا بچّہ بچّہ بولتا ہے۔

آج جبکہ دوسری زبانیں سیکھنے کا شوق لوگوں میں دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے اور زبانوں کو سکھانے کے لیے مختلف سائنسی طریقے کار اپنائے جا رہے ہیں تاکہ لوگ آسانی سے دوسری زبانیں سیکھ سکیں۔ اردو بھی اُن ہی زبانوں میں سے ایک ہے جس کی طرف تعلیم یافتہ طبقہ کا رجحان جاتا ہے۔ اور ایک بہت بڑی تعداد ہے جو اس زبان کو سیکھنا چاہتی ہے۔

اس زبان کے سیکھنے کے سلسلے میں بہت سے کاروباری اور تعلیمی اسباب کے باوجود ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اس زبان کی شیرینی سے متاثر ہیں۔ انھیں غزل بہت پسند ہے اور وہ اس کا صحیح لطف اٹھانے کے لیے زبان سیکھنا چاہتے ہیں۔

طالب علموں میں اردو کے اس ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے بہت سی ہندوستان کی یونیورسٹیز میں اردو کی

ایسی کلاسیس کا انتظام کیا گیا ہے ، جس میں ابتدائی درجات سے اردو پڑھائی جاتی ہے۔ یونیورسٹیز کے علاوہ سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر بہت سے ادارے اسی طرح کی کلاسیس چلا رہے ہیں جن ایسے حضرات کو اردو پڑھائی جاتی ہے ، جو بذات خود تو تعلیم یافتہ ہیں لیکن اردو نہیں جانتے ہیں۔

ان تمام اداروں اور یونیورسٹیز میں نئے تعلیمی نظام اور سائنسی طریقے کار اختیار کیے جا رہے ہیں لیکن ابھی بھی اردو کو بہت سے مراحل طے کرنا ہے کیونکہ اردو کی اپنی مشکلات ہیں جن پر ابھی عبور نہیں پایا جا سکا ہے۔ اس لیے اساتذہ کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن میں سے چند آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

کسی بھی زبان کو سیکھنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اس زبان کو بولا بھی جائے۔ اردو کے لیے آج کے دور میں یہ بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے کیونکہ علاقائی زبانوں کے علاوہ ہندی ضرورت سے زیادہ عام بول چال کی زبان میں استعمال ہو رہی ہے جو باقاعدہ اردو بولنے میں خاصی رکاوٹ پیدا کر رہی ہے اس لیے صحیح اردو کا ماحول آج کسی بھی شہر میں میسر نہیں ہے۔

جدید سائنسی طریقے اور لسانی طریقے جو صوتیات کے سکھانے میں خاصے مددگار ثابت ہوتے ہیں اور جن سے تمام

دوسری زبانیں فائدہ اٹھا رہی ہیں لیکن اردو کی یہ بدقسمتی ہے
کہ ابھی تک اس سلسلے کی کوئی سنجیدہ کوشش سامنے نہیں آئی
ہے، جس سے نئے طالب علم اردو کے ہم آواز الفاظ کو آسانی
سے پہچان سکیں۔ مثلاً انہیں تو "تا لکھنے کو کہا جائے تو وہ سوچ
میں پڑ جاتے ہیں کہ اسے "ت" سے لکھیں یا "ط" سے۔ اسی طرح
کی مشکل "ث"، ص اور س کے لکھنے میں بھی درپیش آتی ہے،
ع اور الف کی آوازوں میں بھی وہ اسی طرح الجھ جاتے ہیں، اس
لیے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ ہجے کی غلطیاں زیادہ کرتے ہیں۔
یہ بھی اکثر دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہندی اور مقامی زبانوں
کے اثر کی بنا پر نئے طالب علم بہت سے اردو کے حروف کا تلفظ
بھی صحیح ادا نہیں کر پاتے ہیں۔ تلفظ کی درستی کے لیے بھی سائنسی
اور لسانی طریقے اختیار کیے گئے ہیں جن میں Language Lab
اور ٹیپ رکارڈر وغیرہ کا استعمال بہت کار آمد ثابت ہوا ہے۔
لیکن اردو میں ابھی اس کا استعمال بہت کم ہے کیونکہ
Language Lab وغیرہ خاص طور پر بہت مہنگی ہیں جسے
خریدنا ہر ادارے کے لیے ممکن نہیں ہے لیکن جن اداروں کے پاس
ہیں وہ ان سے بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں اور تلفظ کے ٹھیک
کرنے میں انہیں بہت کامیابی ملی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے
اسباق بھی اس کی مدد سے پڑھائے جاتے ہیں۔

لیکن پھر بھی ابھی تک ایسی کوئی چیز ہم اردو والوں کے ہاتھ نہیں لگی ہے جس سے "ت" اور "ط" اور ث، ص اور س کے فرق کو محسوس کرایا جا سکے۔

ہم الفاظ کے ساتھ اردو کا رسم الخط بھی نئے طالب علموں کے لیے خاصہ مشکل ہے کیونکہ اس میں طالب علم کو کسی حرف کی تین شکلیں اور کسی کی دو شکلیں یاد کرنا پڑتی ہیں۔ کوئی حروف دونوں طرف جڑنے والے ہیں تو کوئی حرف ایک طرف جڑتے ہیں۔ اسی طرح مختلف شکلوں کے ساتھ ساتھ ان جوڑنے یا ملانے کا مسئلہ طالب علموں کو خاصہ پریشان کر دیتا ہے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ ٹائپ کے بجائے نستعلیق کا رواج ہے جس میں الفاظ کو خوبصورت اور سہولت سے لکھنے نے ایک فن کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن یہ فن اپنی جگہ پہ ہے اور اس کی قدر و منزلت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ نئے طالب علموں کے لیے خاص الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اکتا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ ایک حرف کو تین تین انداز سے لکھا جاتا ہے۔ مثلاً "ب" کو لے لیجئے اور تین ایسے الفاظ لے لیجئے جو "ب" سے شروع ہوتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ "ب" تین مختلف شکلوں میں لکھا جاتا ہے۔

بادل، ابو، اور بم

اردو میں اعراب کا استعمال بہت کم ہوتا ہے اور یہ بھی نئے طالب

علموں کو روانی سے پڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے کیونکہ بہت سے الفاظ کی ہجے بالکل ایک جیسی ہے صرف اُن کو اعراب کی مدد سے ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ار دو والے جملے کی ساخت سے اُسے صحیح پڑھ لیتے ہیں لیکن یہ ایک نئے طالب علم کے لیے بہت مشکل ہے مثلاً "پیٹ" اور "پیٹ" یا اِس، اُس۔ اِن۔ اُن۔

اب نئے جو لسانی طریقے برتے جا رہے ہیں اُن میں اِس، اُس کو تو پیش اور زیر کے ذریعہ ظاہر کیا جا سکتا ہے لیکن "ے" اور "ی" کے فرق کو الگ کرنے کے لیے "ی" کے نیچے خاص طور پر جب یہ بیچ میں آئے تو نقطوں کے نیچے ایک کھڑی زیر (ٖ) کا استعمال کیا جانا چاہیئے۔

لیکن ابھی تک ہمارے پاس ایسی کتابوں کی کمی ہے جس میں اعراب، جزم، تشدید، کھڑی زیر وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ نصاب کے لیے جو کتابیں تیار کی جا رہی ہیں انہیں نئے لسانی اصولوں کے مطابق چھاپا جائے۔ اس طرح سے شائع شدہ کتابوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو سیکھنے والے طالب علم اعراب کی مدد سے صحیح تلفظ ادا کرنے کے علاوہ روانی سے پڑھ سکیں گے۔

اسی طرح "ن غنّہ" اور ہمزہ کے استعمال کے بارے میں بہت سے اختلافات ہیں۔ "ن غنّہ" جب لفظ کے آخر میں آتا ہے

تب تو کوئی پریشانی نہیں ہوتی لیکن درمیان میں اس کا
استعمال نئے طالب علموں کو الجھن میں ڈال دیتا ہے، اس
لیے جب درمیان میں آتے ہوئے "ن" کی آواز کو غنّہ کی آواز
سے ادا کرنا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس پر ایک
نقطہ لگانے کے بعد اوپر ایک چھوٹا سا چاند بنا دینا چاہیے۔
مثلاً" چانْد - اونْٹ

اردو میں ہمزہ کبھی حرف کے طور پر تو کبھی علامت کے
طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اردو اس کی صحیح جگہ کا تعین نہیں
ہو سکا ہے اس لیے بہت سے لوگ اسے بے ضرورت بھی استعمال
کر لیتے ہیں کبھی کبھی ایک ہی جگہ پر "ی" اور "ء" دونوں کی
علامت لگا دیتے ہیں مثلاً" لیئے یہ بالکل غلط ہے۔ اس
کے صحیح مقام کا تعین کرنے اس کے استعمال کو محدود کرنا
ہو گا۔ ورنہ یہ نئے طالب علموں کے لیے ہمیشہ الجھن بنا رہے گا۔

اردو میں قواعد کی کوئی معقول کتاب نہیں ہے جو ابتدائی
درجات یا اُن طالب علموں کے لیے مددگار ثابت ہو جو بالغ ہیں لیکن
اردو سیکھنے کا سلسلہ انہوں نے بعد میں شروع کیا ہے۔

اردو میں ہندی اور فارسی دونوں زبانوں کے قاعدے رائج ہیں
جو ایک طرف تو آسان بھی محسوس ہوتے ہیں لیکن نئے طالب علم
سوال کر اٹھتے ہیں کہ ایک لفظ کی دو جمع کیسے ہو سکتی ہیں۔

مثلاً شاعر کی جمع شاعروں یا شعرا۔ اِن دونوں میں کونسا ٹھیک ہے۔
یہ چیزیں طالب علم کے ذہن کو الجھاتی ہیں انہیں روانی اور شوق سے
اردو سیکھنے میں مددگار ثابت ہونے کے بجائے رکاوٹ بنتی ہیں۔

لاتعداد ابتدائی مراحل سے گزر کر جب طالب علم اِس قابل ہو
جاتا ہے کہ وہ کچھ پڑھنے اور لکھنے لگتا ہے تب اُس کے سامنے مرکب
الفاظ ایک سوال بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ اردو کی امتیازی
خصوصیت رہی ہے کہ ہم دو الفاظ کو ملا کر ایک نئے انداز سے استعمال
کرتے ہیں جو نئے اور دلکش معنی دیتے ہیں۔ مثلاً ہم اور سفر کو ملا کر
استعمال کرتے ہیں ہم سفر (ہمسفر) لیکن انہیں لکھتے وقت الگ
الگ لکھنا چاہیئے ملا کر نہیں لکھنا چاہیئے۔ ان ملا کر بولنا اور تحریر
میں لکھنا زبان کی لطافت اور شیرینی میں اضافہ کرتا ہے لیکن ابتدائی
طلبہ کے مسائل کو دھیان میں رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ انہیں الگ
الگ لکھا جانا چاہیئے۔ کبھی کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ نئے طالب علم
اِن ملے ہوئے الفاظ کو غلط پڑھ جاتے ہیں مثلاً آپ کا کو اکثر لوگ
ملا کر لکھ دیتے ہیں جیسے ہمارے نئے طالب علم آپکا (आप का)
پڑھ لیتے ہیں

الغرض اپنے ناقص تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اردو
زبان سیکھنا اور سکھانا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اسے محسوس
کیا جاتا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں جب کہ دوسری زبان

والوں کولاتعداد سائنسی وسائل فراہم ہیں، جن بنا پر کسی بھی زبان کا سیکھنا بہت آسان ہوگیا ہے لیکن اردو اپنی بے چارگی کی وجہ سے ان سہولیات سے ابھی تک آشنا بھی نہیں ہے۔ البتہ اب اس کی درسی تعلیم میں پرانے انداز کی جگہ نئے انداز نے اختیار کر لی ہے۔ مولوی صاحب اور اُن کی ڈنڈے کی جگہ مہذب استاد اور کے خلوص نے لے لی ہے، جو اپنی محنت اور کاوشوں سے بہت تھوڑے عرصے میں اردو سکھا دیتے ہیں اور طالب علم بہت آسانی سے صاف لکھی ہوئی اردو پڑھ سکتا ہے اسی طرح سے لکھ بھی سکتا ہے اس سب میں ۱۵ سے ۲۰ دن کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

لیکن یہاں ایک بات عرض کر دینا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ استاد کی محنت یا اس کے پڑھانے کا انداز ہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں طالب علم کی محنت اور شوق کو بہت دخل حاصل ہوتا ہے وہ اپنے شوق اور دلچسپی سے اس سے بھی کم عرصے میں سیکھ سکتا ہے۔

یہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے طالب علم رسم الخط کی بعض الجھنوں کی وجہ سے گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن زبان کی کشش انہیں اردو سیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہاں پھر ایک بار استاد کی ذمہ داری ایک اہم رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی وہ رسم الخط سکھاتے وقت طالب علموں میں

کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس کرتا ہے تو اُسے پھر مجبور نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ اُن الفاظ کو دہرائیں یا بار بار لکھیں بلکہ اُسے اپنا موضوع بدل کر انہیں کوئی خوبصورت برجستہ اور آسانی سے شعر سنانا چاہیئے۔ جو اُن کو دلچسپی کا سبب بن سکیں۔ بہت سے طالب علم اسی طرح کی دلچسپی کے سبب کلاس میں آتے ہیں اور پھر وہ یہاں سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر ہی جاتے ہیں۔ اس طرح زبان کی شیرینی انہیں بہت سے مراحل سے گزر لاتی ہے۔

اگر اردو میں ٹائپ کا رواج عام ہو جائے اور مختصر نویسی کو چھوڑ دیا جائے اور ث ص اور س جیسے ہم آواز الفاظ کا کوئی حل تلاش کر لیا جائے تو اردو سے آسان زبان شاید ہندوستان کی زمین پر کوئی دوسری زبان نہ ہوگی۔

الغرض اتنی بہت سی مشکلات کے باوجود اردو دوسری ساری زبانوں کے مقابلے میں آسان اور مختصر زبان ہے۔ جس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب دلکش پیرائے میں ادا کیا جا سکتا ہے اور اس کا سیکھنا پھر لکھنا اور پڑھنا دونوں بہت آسان ہیں جو دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت کم وقت میں آجاتا ہے۔

صحیح اردو لکھنے کے چند اصول

اردو بولنے اور لکھنے والے بھی اکثر اوقات بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں، خاص طور پر لکھتے وقت۔ جس کی سب سے اہم وجہ تو یہ ہے کہ اردو اعراب کے بغیر لکھی جاتی ہے۔ پہلے پڑھنے والا اسے پڑھنے میں غلطی کرتا ہے پھر وہ اسی طرح سے لکھ بھی دیتا ہے۔

دوسرا جو بڑا سبب ان غلطیوں کے کرنے میں اکثر دیکھنے میں ملا ہے وہ ہے عربی نہ جاننا۔ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں وہ عربی کے دقیق الفاظ کو اکثر و بیشتر غلط لکھ جاتے ہیں۔ اس لیے اگر عربی کے دقیق الفاظ کی جگہ عام فہم اور آسان ہندی کے عام بول چال کے الفاظ استعمال کیے جائیں تو غلطی کے امکان بہت کم ہو جائیں گے۔

ہندی کے مخصوص حروف (ٹ، ڈ، ڑ اور ہائے مخلوط) ایسے حروف ہیں جو صرف ہندی آوازوں کے لیے ہی استعمال ہوتے ہیں کسی دوسری زبان میں نہیں آتے۔ اور نہ کسی دوسرے زبان کے حرف سے ان کی آواز ٹکراتی ہے۔

البتہ فارسی اور ہندی کے مشترک حروف ہیں (پ، چ اور گ) یہ حروف کبھی کسی عربی حروف یا آواز سے نہیں ملتے ہیں نہ کسی عربی الفاظ میں ان کا استعمال ہوتا ہے ان سے صرف فارسی اور ہندی کے الفاظ لکھے جانا چاہیے۔

یائے مخلوط یعنی چھوٹی ہے (ہ) کی جگہ بائے ملفوظی (ح) کا استعمال نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی اس کے برعکس بڑی ہے کی جگہ چھوٹی ہے لکھنا چاہیئے۔ اس سے معنی بدل جاتے ہیں تلفظ غلط ہو جاتا ہے جملے کے معنی بدل جاتے ہیں۔

اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ دو زبانوں کے الفاظ ملا کر مرکب الفاظ بنا لیتے ہیں۔ یہ ترکیب بھی مناسب ہے مثلاً عربی کا "لا" اور فارسی کا "چارہ" ملا کر لاچار استعمال کرتے ہیں جب کہ اس لا کی جگہ فارسی کا "نا" استعمال کرنا چاہیے ــــ "ناچار" یہ ترکیب صحیح ہے ــــ مرکب الفاظ کے سلسلے میں دوسری اہم چیز یہ ہے ایسے تمام الفاظ کو الگ الگ لکھنا چاہیئے ملا کر نہیں لکھنا چاہیئے ــــ مثلاً ہمسفر۔ ہم سفر

ہندی کے جن الفاظ میں چھوٹی ہ لکھی جاتی ہے وہ پڑھنے یا بولتے وقت الف کی آواز دیتی ہے مثلاً چند شہروں کے نام ہی لے لیجیئے۔ شملہ۔ پٹیالہ وغیرہ ــــ

آج جب کہ اعراب کا چلن پہلے کے مقابلہ میں خاصہ زیادہ ہو گیا ہے پھر بھی لوگ۔ اعراب لگانا بھول ہی جاتے ہیں لیکن ایسے الفاظ پر خاص طور پر دھیان دے کر اعراب لگانا چاہیئے جن سے معنی بدل جانے کا اندیشہ ہو ــــ مثلاً اِن، اُن ــــ اِس اور اُس اِدھر اُدھر وغیرہ۔

اگر ان چند موٹی موٹی باتوں کو دھیان میں رکھ کر اردو لکھی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اردو لکھنے میں غلطیوں کے امکان خاصے کم ہو جائیں

غیر ہندی داں حضرات کو اُردو پڑھانے کے اصُول

علم لسانیات کے طریقۂ عمل کے ذریعہ چند اصول مرتب کیے گئے ہیں جن کا ذکر میں لازمی سمجھتا ہوں تاکہ اُن سے مدد لی جا سکے اُن حضرات کو اردو پڑھاتے وقت جن کی مادری زبان ہندی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں لسانی اصول بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں اور ہمارے مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان اصولوں میں آپ تھوڑی بہت تبدیلی اپنی ضرورت کے مطابق کر سکتے ہیں۔

لکھنے سے پہلے بولنا۔ پہلے سُننا اور پھر بولنا سکھائیے۔ اس کے بعد پڑھنا اور پھر لکھنا۔ کیونکہ ہم بول کر ہی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ تحریر زبان کے اُتار چڑھاؤ۔ اس کے ترنم اور زور وغیرہ جیسی باریکیوں کی ترجمانی نہیں کر سکتی ہے۔

اس طرح طالب علم زبان کے بنیادی جملوں کو سمجھ کر انہیں بول کر
اور بھی زیادہ جملے بول سکتا ہے اور جب پڑھنے کا وقت آئے گا تو
وہ طالب علم ان ہی جملوں کو آسانی سے پڑھ سکے گا۔ تحریر سے
پہلے بولنا سکھانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر غیر ہندی داں حضرات
پہلے بولنا نہیں سیکھیں گے تو وہ تلفظ کی غلطیاں زیادہ کریں گے۔
مثال کے طور پر ہم اردو میں اعلیٰ اور عیسیٰ لکھتے وقت الف
کا استعمال کرتے ہیں حالانکہ لکھتے ہیں اعلیٰ اور عیسیٰ
لیکن پڑھتے ہیں الف کی آواز سے۔ جب ان کو ان آوازوں کے بولنے
کی عادت ہوگی تو پھر وہ لکھتے اور پڑھتے وقت بہت ہلکے سے اشارے
سے اس نقطے کو سمجھ جائیں گے کہ ہم کیوں "ی" کے اوپر الف کا
استعمال کرتے ہیں اور پھر الف کی آواز سے پڑھتے ہیں اور اس طرح وہ
صحیح تلفظ ادا کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

بنیادی جملے:- ہماری سوسائٹی کے جو آداب ہیں
ان سے متعلق چھوٹے چھوٹے جملے پہلے
طالب علموں کو سکھانا چاہیے جس سے وہ آداب اور تہذیب
سے بھی واقف ہو جائیں گے اور ساتھ ہی تلفظ بھی ٹھیک ہوتا
جائے گا۔ اس طرح کے جملے بولنے میں وہ کچھ غلطیاں ضرور
کریں گے۔ لیکن جب وہ ذرا سی محنت سے انہیں یاد رکھنے کی
کوشش کریں گے تو ان کی یاد رکھنے کی طاقت میں اضافہ ہوگا۔

اور پھر جب لکھنے پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوگا تو ان ہی جملوں سے مشق کرائی جانی چاہیئے۔ اس طرح طالب علم پر زور کم پڑتا ہے اور سوچنے سمجھنے میں اُسے کوئی دِقت پیش نہیں آتی ہے۔ البتہ تحریر کے لیے اُسے سخت محنت کی ضرورت ہوگی ــــــ

اس طرح زبان سکھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ چند جملے انہیں ٹیپ ریکارڈ پر دیئے جائیں وہ انہیں سنیں اور پھر دہرائیں۔ جو ٹیپ ہوجائیں گے۔ پھر وہ ٹیچر کے بولے ہوئے جملوں سے اپنے بولے ہوئے جملوں کا خود مقابلہ کر سکیں گے اور انہیں خود اپنی غلطی کا احساس ہوجائے گا اس طرح Language Lab اور ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے وہ بہت جلد صحیح جملے بولنا سیکھ جاتے ہیں اور اُن کا تلفظ بھی صحیح ہوتا ہے اور جملے کو بار بار بولنے سے وہ جلد ذہن نشین ہوجاتا ہے ــــــ یہ جملے کئی طرح کے ہو سکتے ہیں مثلاً کسی سے ملاقات کرتے وقت کی بات چیت۔ کسی محفل کی گفتگو۔ موسم کا حال۔ کسی سے مزاج پرسی کرنا یا بیمار سے اُس کی خیریت دریافت کرنا وغیرہ وغیرہ۔

صوتی نظام اور اس کا استعمال:-

اب طلبہ کو زبان کے صوتی نظام اور اصوات کو بار بار سمجھانا چاہیئے اور نقل کر کے بتانا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے متقابل الفاظ بھی بولنا چاہیئے تاکہ وہ فرق محسوس کر

سکیں ایک آواز کا دوسری آواز سے مقابلہ کر کے سمجھانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ نئی آوازیں جو خاص طور پر اُن کی مادری زبان میں موجود نہیں ہیں اُن پر ضرورت سے زیادہ زور دینے اور مشق کرانے کی ضرورت ہے مثلاً ع، غ، ف، ق، خ، ذ اور ز وغیرہ۔ اِن آوازوں کو بار بار بول کر بتانا چاہیئے پھر ان سے لکھے جانے والے الفاظ کو بولنا چاہیئے جس میں وہ مختلف حالتوں میں استعمال ہوئے ہوں۔ یہ سب کبھی ٹیپ رکاڈ کی مدد سے بہت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ طالب علموں کو حلق، تالو اور زبان کی مختلف کیفیات کے نقشے بنا کر سمجھانا چاہیئے کہ بولتے وقت کس لفظ کو زبان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ وہ تالو سے ٹکراتی ہے یا دانتوں سے اس حرف کی ادائیگی کے وقت زبان کی نوک استعمال ہوتی ہے یا بیچ کا حصہ یا ہم کسی آواز کے ادا کرنے میں حلق یا ناک کا استعمال کرتے ہیں۔

الفاظ پر عبور:- جب طالب علم ابتدائی جملوں اور صوتی نظام کی تراکیب کو سیکھ رہا ہو تو اس درمیان میں اس پر الفاظ کا دباؤ کم رکھنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ہی الفاظ کی اُلٹ پھیر سے نئے جملے یا صوتی آوازوں کے اتار چڑھاؤ کو سکھانا چاہیئے۔ جب وہ الفاظ یاد ہو جائیں ان کا تلفظ صحیح ہو جائے تب آگے بڑھنا چاہیئے۔ اور اب نئے اور پرانے الفاظوں کو ملا کر جملے بنانا چاہیئے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ Vocabulary

رفتہ رفتہ بڑھانا چاہیئے - اور سیکھے ہوئے الفاظ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیئے -

فرق پر زور دیجیئے :- جو طالب علم اردو سیکھ رہا ہے، اس کی مادری زبان اور اردو میں بہت سی باتیں اور چیزیں یکساں ہونگی۔ اُن کو تو وہ طالب علم آسانی سے سیکھ جائے گا لیکن دراصل ہمیں زور اُن ہی چیزوں پر دینا ہوگا جو طالب علموں کے لیے نئی ہونگی جنہیں اُس نے پہلے نہ سُنا ہوگا اور نہ بولا ہوگا۔ مثال کے طور پر خ، ق، ذ، ز اور غ وغیرہ کی آوازیں ایسی ہیں جو عربی فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں میں نہیں ملتی ہیں تو ہمیں زور ان ہی آوازوں کے ادا کرنے پر دینا ہوگا۔

تحریر بولی کی ترجمانی کرتی ہے :- جو کچھ بول کر سیکھا طالب علم نے پہلے ہے یا سُن کر سمجھا ہے اب اُن ہی چیزوں کو تحریر کی شکل میں لایا جائے تو طالب علم آسانی سے سیکھ سکتا ہے کچھ الفاظ ایسے ہیں جو بولنے اور تحریر میں یکساں نہیں ہیں تو اسے ہم رسم الخط کی خرابی سے تعبیر کر سکتے ہیں مثلاً "بالکل لکھتے وقت الف۔ اِس میں زیادہ ہے یہ لکھا تو جاتا ہے لیکن بولا نہیں جاتا۔ ایسے چند الفاظ کو چھوڑ کر باقی تمام الفاظ تحریر کا صحیح روپ ہوتے ہیں یعنی جس طرح بولے جاتے ہیں اُسی طرح لکھے جاتے ہیں۔ یہ بھی دلچسپ حقیقت ہے۔

کہ ہر زبان کا لکھنا اور پڑھنا بولنے سے قطعی مختلف ہوتا ہے لیکن زبان سکھاتے وقت پہلے بولنا پھر لکھنا اور پڑھنا سکھانا چاہیئے۔

ترتیب وار :- دوسری زبان سیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ نئی عادت ڈالنا، نئے اصول اختیار کرنا۔ یہ آسان کام نہیں ہے اس میں طالب علموں کو خاص محنت کی ضرورت پڑتی ہے اور اساتذہ حضرات کو بھی چاہیئے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیں، اور بار بار مشق کرائیں اور جو ترتیب زبان سکھانے کے لیے بنائی گئی ہے اس کا خیال رکھیں۔ اگر اس ترتیب کا خیال نہ رکھا گیا اور نئے نئے الفاظ کی بھرمار کردی گئی تو طالب علم یقیناً گھبرا جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو۔

نئی عادتیں دھیرے دھیرے بنا کرتی ہیں اس لیے ہمیں پہلے بولنا سکھانا چاہیئے۔ پہلے الفاظ۔ مثلاً" سلام۔ اس کا جواب مزاج پرسی کے طریقے اور الفاظ، پھر چھوٹے چھوٹے جملے۔ پھر ان ہی جملوں میں لفظ نکال کر اسے سمجھانا چاہیئے اس کے بعد جملے کی بناوٹ پھر بتانا چاہیئے۔ اس سب کو کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں سوال۔ جواب اخلاقی جملے۔ مخاطب کرنے والے جملے سوالیہ جملے اور بیانات کی صورت میں مواد کو پیش کرنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ

اس کا ایک طریقہ مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے آپ نے اپنے

طالب علم کو ایک جملہ - یا۔ "آپ جارہے ہیں" اب اسے
سے فرق سے تبدیل کرتے جایئے۔ اور طالب علم اس کو آسانی سے
سمجھ کر فرق کو محسوس کرتا ہوا یاد کرتا چلا جائے گا۔ مثلاً "

آپ جارہے ہیں

آپ اسکول جارہے ہیں

آپ کہاں جارہے ہیں

آپ کس اسکول جارہے ہیں

آپ کا اسکول کہاں ہے

آپ اسکول کب جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض جملے ہم بات چیت کے دوران
فطری طور پر بول جاتے ہیں۔ ان کا سیکھنا اور سکھانا بہت ضروری
ہے اُن سب جملوں کو اسی طریقے پر سکھانا چاہیئے۔ مثلاً " آپ
کو کوئی چیز دیتا ہے آپ فوراً اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں یا غلطی
پر معافی مانگتے ہیں۔ ان سب چیزوں کو اوپر بتائے گئے اصولوں
کے تحت یاد کرانا چاہیئے۔

زبان کا استعمال اور ترجمہ :- ترجمہ زبان کے استعمال کا نعم
البدل نہیں ہے کیونکہ کچھ ایسی
زبانیں بھی ہیں جن میں بہت الفاظ کسی نہ کسی حد تک معنی کے لحاظ سے
یکسانیت رکھتے ہیں اور اکثر طالب علم اس لیے ترجمہ کر لیتے ہیں۔ یہ وہ

یہ بہت بڑی غلطی کرتے ہیں اِس چیز سے انہیں روکئے ورنہ وہ راہ سے ہٹ جائیں گے۔ ترجمے کی عادت طالب علموں میں نہ ڈالیے۔ لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے سے غلط جملے بنتے ہیں۔ ترجمے کا فن یا اصول حقیقتاً "سننے سمجھے بولیے" پڑھنے اور لکھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ ترجمہ اسں وقت تک صحیح اور قابل تعریف نہیں مانا جاسکتا جب تک کہ مترجم کو دوسری زبان پر پورا عبور حاصل نہ ہو اور ابھی ہمارے طالب علم اِس درجہ سے دور ہیں اِس لیے انہیں روکنا ضروری ہے انہیں زیادہ سے زیادہ زبان پڑھنے اور اسی کو سمجھنے پر زور دینا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی جان لینا بہت ضروری ہے کہ دو زبانوں کے لوگ ترجمہ کر کے بول نہیں سکتے ہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ ترجمے کی مدد سے دوسری زبانوں کے پیچیدہ مسائل کو جان ضرور سکتے ہیں مگر ترجمہ کسی بھی صورت میں ایک نئی زبان سیکھتے وقت مددگار ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔

صحیح زبان کا پڑھانا:۔ زبان کو اُس کی اصل شکل میں ہی پڑھانا چاہیے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرنا چاہیے جو زبان کی ترتیب ہے اُسے مدنظر رکھ کر ہی پڑھانا چاہیے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ جس انداز میں مادری زبان والا بولتا ہے ایک طالب علم جس کی مادری زبان اُردو

نہیں ہے وہ بھی اِسی انداز میں بات چیت کرے گا۔ اس طرح استاد بھی بہت سی پریشانیوں سے بچ جائے گا البتہ مقامی بولیوں کا اثر تو ظاہر ہو کے رہتا ہے اُسے آپ اتنی آسانی سے الگ بھی نہیں کر سکتے ہیں اور ایسے اتنی سنجیدگی سے لینا بھی نہیں چاہیئے۔ مثال کے طور پر آپ نے اُسے سکھایا "قفل" اس نے اسے یاد تو کر لیا لیکن جب وہ روانی سے لکھتا ہے یا اپنے آپ کوئی جملہ بناتا ہے تو وہ اگر 'تالے' کا لفظ استعمال کرتا ہے تو یہ جائز ہے

مشق :۔ مدرس کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مشقیں کلاس میں ہی کرائے اور کم وقت صرف کرے آگے کچھ انہیں بتاتے یا پڑھانے کے لیے ۔ بار بار ایک چیز کو بولنے، لکھنے اور پڑھنے سے وہ آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے اور پھر لکھنے اور پڑھنے پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کتاب کے اسباق بھی نقل کرانا چاہیئے ۔

جوابات کی ترتیب :۔ جب کوئی طالب علم کبھی سوال کا جواب نہ دے پائے تو مدرس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ انہیں بار بار سمجھائے اور انہیں کہے کہ وہ اسے بولیں اور لکھیں بھی ۔ اس طرح کی مشق بہت ضروری ہے کیونکہ جب طالب علم کسی نئی زبان کو سیکھ رہا ہوتا ہے تو انہیں بہت سی چیزیں سننے، بولنے اور سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہیں۔ کیونکہ اُن کے کان اِن

سب نئے الفاظ کے لیے آشنا نہیں ہوتے ہیں۔ ان کی اس مشکل کو دو طریقوں سے حل کیا جانا چاہیئے۔

(الف) اس جملے یا بات کو دو تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں بانٹ دیجئے اور پھر مشق کرا دیئے۔ کچھ دیر بعد پھر ان دونوں جملوں کو ملا دیجئے۔ اور بولنے یا لکھنے کو کہیے۔

(ب) اگر تلفظ وغیرہ کی غلطی ہے تو اسے بار بار دہرا کر ہی ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔

روانی اور اسلوب:- زبان سکھانے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ الفاظ سیکھ جائے اور چھوٹے چھوٹے جملے ادا کرنے لگے۔ درحقیقت زبان سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ روانی سے پڑھ لکھ اور بول سکے اور جو زبان کا اسلوب ہے اس کا پاس رکھے تب ہی تو زبان سکھانے کا مطلب اور مقصد پورا ہوتا ہے ورنہ نہیں۔
جب طالب علم صحیح زبان لکھنے اور بولنے اور پڑھنے لگے تو مدرس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرے اور انہیں نئی چیزیں ان کے شوق اور مزاج سے مطابق رکھنے والی انہیں پڑھنے کو دے جس سے طالب علموں میں شوق اور محنت کا جذبہ پیدا ہوگا۔

زبان سے وابستہ تہذیب :- اُردو زبان سے وابستہ لوگوں کی جو تہذیب ہے جیسے گنگا جمنی تہذیب کہا جا سکتا ہے جو ہندؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی تہذیب کا ایک بہترین نمونہ ہے جسے اردو والوں نے اپنا لیا ہے جو اب اردو بولنے والوں کی میراث بن چکی ہے اِس تہذیب اور اس کے اداب و اخلاق سے نئے طالب علموں کو جو اردو سیکھ رہے ہیں واقف کرانا چاہیئے۔ کیونکہ زبان اور تہذیب ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور زبان کے مطالعے کے دوران بہت سی باتیں ایسی آجاتی ہیں۔ جس کو تہذیب کے ہی دائرے میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر وہ تہذیب سے واقف ہوگا تو پھر اسے اُن تمام چیزوں کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی تہذیب اور زبان کا تو تعلق اتنا گہرا ہے کہ بہت سے الفاظ تہذیب سے وابستہ ہوتے ہیں اور اُن کے معنی بتا دینے پر تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو کی عکاسی ہو جاتی ہے وہ پوری طور پر کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ تہذیب کی ترجمانی زبان سے ہی ہوتی ہے۔

پڑھانے کا مقصد :- زبان پڑھانے کا مقصد دراصل زبان سکھا کر طالب علم کو اس قابل کر دینا ہے کہ وہ خود پڑھ سکے۔ لکھ سکے اور بول سکے۔

اس کورس کی کتابوں اور تحریری مشقوں کے دوران اگر آپ اشعار
یا لطیفے بھی سنائیں تو کوئی ہرج نہیں ہے یا تہذیب سے متعلق
باتیں بتائیں تب بھی کوئی بات نہیں۔ یہ سب زبان کی پڑھائی کے
سلسلے میں معاون ہی ثابت ہونگے۔ اکثر و بیشتر تہذیب و تمدن
سے متعلق فلمیں بھی دکھانا چاہیئے لیکن ان سب چیزوں کو ایک دائرے
میں رکھنا ہوگا تاکہ کلاس کا ماحول برقرار رہے اور طالب علم دلچسپی
کے ساتھ اپنی پڑھائی بھی کرتے رہیں اور اسی زبان میں یعنی اردو میں کچھ
شعر و شاعری ہو۔ افسانے اور کہانی کی بات ہو یا کوئی اچھی سی
فلم ہو جو اُن کی تفریح کے ساتھ اُن کی معلومات اور الفاظ اور تہذیب
سے متعلق ماحول کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو۔ اس سب کے
ساتھ ہمیں یہ نہیں بھول جانا چاہیئے کہ ہمارا اصل مقصد اردو
زبان سکھانا ہے اگر ان چیزوں کی زیادتی ہو جائے گی تو ہمارا
اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لیے ان سب چیزوں کا
استعمال اسی حد تک کرنا چاہیئے جہاں تک یہ زبان کے سکھانے
میں معاون ثابت ہو سکیں۔

الغرض مندرجہ بالا باتوں کا خیال رکھ کر غیر ہندی داں
طلبہ کو اردو پڑھائی جائے گی تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی آسانی
سے رسم الخط سیکھنے کے ساتھ ساتھ بولنا اور پڑھنا بھی
سیکھ جائیں گے اور انہیں تھوڑا سا زیادہ وقت ضرور درکار ہوگا۔

لیکن اُردو ایسی کوئی مشکل زبان نہیں ہے جسے سیکھا نہ جا سکے۔ یورپین ممالک کے لوگوں کے مقابلے میں مدراسی، بنگالی اُردو زیادہ آسانی سے سیکھ لیتے ہیں کیونکہ کسی نہ کسی انداز میں ان کے کان اُردو کی آوازوں سے آشنا ہوتے ہیں۔

تجزیہ

اس سے پہلے باب میں ہم زبان کے پڑھانے کے اصولوں پر بحث کرتے رہے ہیں آیئے اب تجزیہ کریں۔ کہ یہ اصول عمل پیرا بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ حالانکہ اصول تبدیل نہیں ہوا کرتے ہیں، پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں پڑھاتے وقت ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ باتیں یہ ہیں۔

(i) طالب علم۔ (ii) مواد یعنی جو کچھ آپ پڑھائیں گے اور اس کے استعمال ہونے والے آلات۔ مثلاً ٹیپ، سینما، ٹی، وی، Language lab وغیرہ۔ (iii) مدرس

(iv) مواد کی ترتیب۔

(i) طالب علم۔ طالب علم کی عمر، اس کا تعلیمی درجہ، اس کی صلاحیت اور زبان سے متعلق اس کا پچھلا تجربہ وغیرہ وہ باتیں ہیں، جن کا ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ عمر ایک خاص بات ہے کیونکہ بچوں اور جوانوں کو مختلف انداز سے پڑھانا ہوگا اس اعتبار

سے زبان سیکھنے کی خصوصیات کو عمر کے اعتبار سے ہم چار حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱- اسکول سے پہلے کا زمانہ یعنی گھر کی تعلیم

۲- ابتدائی درجات کی تعلیم

۳- مڈل یا ہائی اسکول کی تعلیم

۴- کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم

گھر کے ماحول میں بچے اگر کسی دوسری زبان کو سیکھتے ہیں تو وہ مادری زبان کی طرح صحیح سیکھ سکتے ہیں اور وہاں کسی خاص طریقے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے زیادہ سے زیادہ اس زبان کا ماحول سازگار ہونا چاہیئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ والدین کسی ایسے علاقے میں اپنی نوکری یا تجارت وغیرہ کے مقاصد سے رہنا شروع کر دیتے ہیں اور بچہ مادری زبان کے ساتھ وہاں کی زبان بآسانی ماحول کے اثر سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے وہ مادری زبان کی طرح سے روانی سے بولتا ہے۔ اسے طالب علم کو پڑھانے کے لیے کوئی خاص اصول مرتب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

ہاں البتہ جو بچے ابتدائی درجات تک تعلیم حاصل کر چکے ہوں اور پھر انہیں کسی دوسری زبان کو سکھانا ہو تو انہیں کھیل اور بار بار یاد کرانے کے اصولوں کے تحت ہی ہم کسی زبان کو سکھا سکتے

ہیں اور چھوٹی عمر ہونے کی وجہ سے وہ کھیل کھیل میں بہت سی باتیں سیکھ جائیں گے اور تلفظ بھی اُن کا صحیح ہوگا۔ اس پر بھی زیادہ محنت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

لیکن جب بچّا ہائی اسکول کی عمر میں آکر کسی دوسری زبان کو سیکھے گا تو اس کے سامنے کچھ مقاصد ہونگے۔ یہی حال کالج اور یونیورسٹی کے طالب علموں کا بھی ہوگا۔ تو یہ اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے زیادہ دھیان اور توجہ سے پڑھیں گے۔

اب یہاں اس عمر میں آکر طالب علم میں خود بخود زبان سیکھنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ تو ضرور کم ہو جاتی ہے لیکن اس کی جگہ شوق اور دلچسپی لے لیتی ہے اسی بنا پر اپنی محنت اور قابلیت کے سہارے زبان آسانی سے سیکھ جاتے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنا چاہیئے کہ زبان سیکھنے کی صلاحیت جو خدا داد ہے وہ ۱۴ سال کی عمر کے بعد گھٹنا شروع ہو جاتی ہے اس لیے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بچّا زیادہ تیز رفتاری سے زبان سیکھتا ہے بہ نسبت بڑوں کے۔

(۱۱) تعلیمی اعتدال۔ زبان کی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کے بھی اب دو گروپ ہو گئے ہیں ایک وہ جو پہلے سے تعلیم یافتہ ہیں اور دوسرے وہ جو بالکل لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں۔ ان دونوں گروپوں کو الگ الگ انداز سے تعلیم دینے کی ضرورت

ہے یعنی ہر ایک کا طریقہ تعلیم جدا ہوگا۔ اُسے ہمیں طریقۂ تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے نصاب کو دونوں کے انداز سے الگ الگ مرتب کرنا ہوگا۔

(ii) صلاحیت ۔ زبان سیکھنے کے سلسلے میں سب ہی لوگوں کا ایک جیسا معیار نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔ سب ایک جیسی ذہانت کے مالک نہیں ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں میں یاد کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے تو کچھ سمجھ جلدی پاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو بار بار سمجھانا پڑتا ہے۔

غرض زبان سیکھنے کے سلسلے میں یہ دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ لوگ یاد کیے ہوئے جملوں کو موڑ کر ان سے آسانی سے دوسرے جملے بنا لیتے ہیں۔ تو کچھ لوگ ایک جملہ مثال میں لے کر اس سے مختلف جملے بنا لیتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ پہلے قواعد سیکھتے ہیں اور پھر جملے بنانا پسند کرتے ہیں۔

یہ ایک عام سی بات ہے اور معلّم اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی کلاس کے تمام طالب علم ایک جیسی صلاحیت کے مالک نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک اوّل آتا ہے تو دوسرا فیل بھی ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ انداز زبان سیکھنے کا ہے۔ کوئی ۱۰ ماہ میں زبان سیکھ کر اخبار اور رسائل پڑھنے لگتا ہے اور خط لکھنے کے قابل ہو جاتا ہے جبکہ کچھ لوگ صرف جوڑ کر پڑھنے اور دھیرے دھیرے

لکھنے کی صلاحیت پیدا کر پاتے ہیں۔

(iv) جسمانی خامیاں ۔ اگر طالب علم جسمانی دماغی خرابی رکھتا ہے تو ہمیں اسے پڑھانے کے طریقے کو بدلنا ہوگا۔ اور مختلف حالتوں میں مختلف طریقے استعمال کرنا ہونگے۔ مثال کے طور پر ایک اندھے طالب علم کے لیے درسی کتابیں اور سینما یا تصاویر جیسی چیزیں جن کا تعلق دیکھنے سے ہے وہ سب بے کار ہیں۔ یہاں تک حروف کا بھی استعمال نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس میں سننے، سمجھنے اور یاد کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوگی کہ وہ آنکھوں والوں کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔ اس لیے اِن لوگوں سے زیادہ تر کام بول کر لیا جانا چاہیئے۔ تب ہی یہ لوگ کچھ سیکھ پائیں گے۔

(v) قابلیت ۔ جب قابلیت کا درجہ اونچا ہوتا ہے تو یہ دیکھا گیا ہے کہ زبان سیکھنے کی رفتار سست ہوتی ہے اس لیے پہلے بولی سیکھنا چاہیئے۔ اور الفاظ کا دباؤ کم ہونا چاہیئے۔ اس طرح طالب علم کو اپنی کچھ عادتوں پر قابو پانے میں مدد ملے گی کیونکہ اسے نئی زبان کے لیے نئی عادتیں ڈالنا ہونگی۔ ساتھ ہی ساتھ ایسے طالب علموں کو زبان اور اس سے متعلق تہذیب، و تمدن سے تعلق رکھنے والی باتیں بتانا ضروری ہوگا تاکہ وہ اپنی دلچسپی برقرار رکھ سکے اس لیے اُس کے زبان سیکھنے کی رفتار میں خاصی تیزی آئے گی۔

(vi) مقاصد ۔ بولی سیکھنا ہر حالت میں ضروری ہے۔

اس لیے تلفظ میں ماہر ہونا ہر ایک معلم کے لیے ضروری ہے۔ تاکہ وہ طالب علموں کی تلفظ کی غلطیاں دُور کر سکے۔

(vii) مواد۔ معلّم اور طالب علم کے پاس زبان سے متعلق جو آلات اور امدادی اچیزیں ہوتی ہیں۔ اُن میں کمرے کی خالی دیواروں سے لے کر سخت کرسیاں Language Lab ٹیلی وژن۔ ٹیپ رکارڈ اور دوسری چیزیں شامل ہیں۔ ان چیزوں کی مدد سے جب ہم زبان سکھانے کا کام شروع کرتے ہیں تو ہماری اُمیدیں بڑھ جاتی ہیں اور ہم بہتر انداز سے کام کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم اپنے مواد کو بہتر ڈھنگ سے پیش کرتے میں کامیاب ہوتے ہیں اور جب ان سب کے ساتھ ایک معلّم طالب علموں کی رہنمائی کرتا ہے تو مواد کی فراہمی میں زیادہ سہولیت ہو جاتی ہے اور طالب علموں کی دلچسپی بڑھتی ہے کیونکہ انہیں مواد اپنے مزاج اور مذاق کے مطابق ملتا ہے۔

(viii) مدرس۔ وقت صرف کرنے اور قابلیت کے حساب سے بھی زبان پڑھانے والے معلمین میں بھی بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں زبان کا معلم وہی ہو سکتا ہے جس کی مادری زبان اُردو ہو۔ اور وہ اپنی دن رات کی زندگی میں بھی اُردو کا استعمال کرتا ہو۔ وہ ایک تہذیب یافتہ انسان بھی ہو ساتھ ہی اس کا ترتیب یافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔ تب ہی وہ مختلف

انداز اختیار کرکے اور بہتر انداز سے پڑھا سکے گا کیونکہ وہ زبان کی باریکیوں کو جانتا ہو گا۔

(۱×) لسانی و تہذیبی تجاویز ۔ کیا پڑھانا ہے؟ اور کیا پڑھایا جا سکتا ہے اس کو تجویز کرنا بھی ایک بہت بڑا کام ہے جو ایک تجربہ کار مدرس ہی کر سکتا ہے ساتھ ہی مادری زبان جاننے والا مدرس ہی بہتر طور پر نصاب بنا سکتا ہے جو زبان سیکھنے والوں کے لیے مناسب اور ضروری ہو گا۔ لیکن اگر زبان ایسی جگہ پر سکھائی جا رہی ہو جہاں وہ بولی نہیں جاتی ہے تو پھر ہمیں مکمل طور پر مدرس کے جمع کیے ہوئے مواد پر ہی انحصار کرنا ہو گا۔

(×) دراصل زبان پڑھانے کے لیے اس علاقے کی بھی سخت ضرورت ہے جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے ۔ کیونکہ ماحول اور آس پاس کے لوگوں سے ملنا جلنا ، بازار اور تفریحی مقامات وغیرہ خود بہ خود مجبور کر دیتے ہیں کہ آپ زبان بولیں اور سنیں ۔ اس طرح طالب علم زیادہ صحیح انداز سے اور بہتر طور پر زبان سیکھ جاتے ہیں ماحول میں رہ کر زبان سیکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ بامحاورہ زبان بولنے لگتے ہیں۔
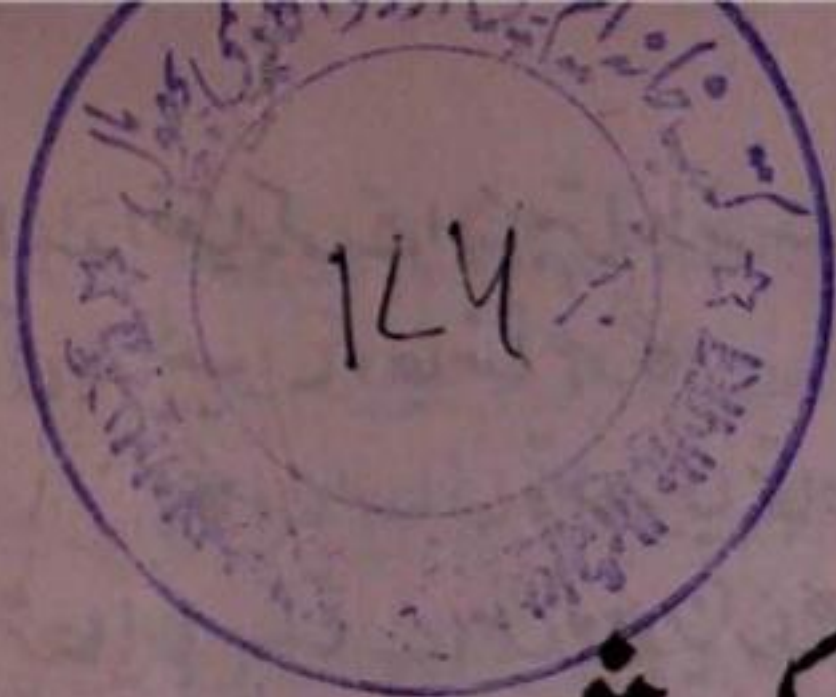
ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو ادب کی تعلیم

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کے سیکھنے میں اُس زبان کا ادب بہت مددگار ثابت ہوتا ہے اور اُن مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتا ہے، جس کے تحت کسی بھی شخص کے ذہن میں اس زبان کے سیکھنے کا خیال آتا ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ ادب کے مطالعے کا سوال مقاصد سے جڑا ہوا ہے۔

آج کل اردو پڑھنے والوں کے مقاصد جُدا جُدا ہیں مثلاً کسی کو اردو کی شاعری نے متاثر کیا ہے، کسی کو غزل موسیقی کی جان معلوم ہوتی ہے۔ تو کوئی پرانے ادب دفاتر کے خزانوں سے کچھ کام کی باتیں تلاش کرنے کی جستجو میں اردو زبان سیکھنا چاہتا ہے الغرض کسی کا مقصد تعلیمی ہے تو کسی کا تہذیبی اور کسی کا خالص کاروباری۔

اُردو زبان آج جن حالات سے دوچار ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اِس کے باوجود مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہورہی ہے کہ آج بھی اِس زبان سے لوگوں کے مقاصد جڑے ہوئے ہیں اور ایک بہت بڑی تعداد نے، جو پچھلے سالوں میں سیاسی حالات کا شکار ہونے کی وجہ سے اُردو زبان و ادب کی تعلیم سے محروم رہ گئے تھے اب اِس زبان کو پھر سیکھنے اور پڑھنے کے کوشاں ہیں۔

بہرحال اُن کے مقاصد جو بھی ہوں لیکن وہ جب اُردو پڑھنے آتے ہیں تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ادب ہی اُن کو اُردو زبان سکھانے اور اُن کے مقاصد کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوتا ہے اِس بات پر بہت سے محققین کی بھی یہی رائے ہے کہ زبان کے سکھانے میں سب سے موثر طریقہ ادب ہی ٹھہرتا ہے لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کونسا ادب ؟ ادب بھی دو طرح کا ہوتا ہے ایک مقبول ادب اور دوسرا سنجیدہ ادب۔ مقبول ادب کا تعلق عوام سے زیادہ ہے۔ جس میں زندگی کے مسائل دُکھ سُکھ اور خارجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری اس طرح کی جاتی ہے کہ عام قاری اِس کے آئینہ میں اپنے آپ کو پہنچان سکے۔ دراصل ایسا ادب اجتماعی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

ادب کی دوسری قسم وہ ہے جسے ہم سنجیدہ ادب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ انفرادی عمل کا متقاضی ہوتا ہے اور تحقیق کے پیچیدہ مسائل سے گزر کر ایک نئی حقیقت کو دریافت کرتا ہے۔ ظاہر ہے

کہ ایسے ادب کا مطالعہ ایک خصوصی توجہ کا مستحق ہوتا ہے لیکن ایسا ادب ثانوی زبان کی تعلیم میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتا۔ ثانوی زبان کی تعلیم کے لیے جن اسباق کا انتخاب کیا جائے وہ میرے خیال میں اوّل الذکر ادب میں سے ہونا چاہیے، کیونکہ ان عام فہم ادبی تخلیقات کو ثانوی زبان کے طلبہ زیادہ آسانی سے سمجھ لیں گے۔

ادب کے مناسب اور موضوع انتخاب کی کمی کا احساس تقریباً ہر جگہ کے انصاب میں ہوتا ہے، کیونکہ ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس کا کام سارے ہندوستان میں کسی نہ کسی پیمانے پر ہو رہا ہے لیکن اسباق کی مناسبت اور طلبہ کے معیار کے مطابق انتخاب کی طرف خاطر خواہ کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے اور اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بالغان کے نصاب میں بھی وہی پرانی نظمیں آج تک شامل ہیں جو بچوں کے نصاب کا ایک حصّہ ہیں۔ وہ بچوں کے لیے تو مناسب ہیں لیکن بالغان کے لیے قطعی نہیں۔ مثلاً

نہر پر چل رہی ہے پن چکّی ۔ دھن کی پوری ہے کام کی پکّی

اس طرح کا ادب پڑھانے سے لوگوں میں جو اردو سیکھنے کا جوش و خروش ہوتا ہے اسے سخت دھکا پہنچتا ہے کیونکہ اس سے ان کے ذوق اور معیار کی تکمیل نہیں ہوتی ہے اور وہ اکثر گھبرا کر اردو سیکھنے کا پروگرام ملتوی کر دیتے ہیں۔

آیئے اس کو اگر ہم اس طرح دیکھیں کہ ایک طالب علم کو حروفِ تہجی سے

دے کر جملوں کی بناوٹ تک آتے آتے کس قدر صبر و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے اور اس کے بعد بھی اسے کوئی نظم یا غزل اپنے معیار اور مذاق کی پڑھنے کو نہ ملے تو اس کے ذوقِ سلیم کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ اکتا کر بھاگ جاتا ہے۔ اس لیے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ادب ہی واحد طریقہ ہے جو اُن کی دلچسپی برقرار رکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اُن کے معیار اور مذاق کے مطابق ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان کی ابتدائی تعلیم کے مراحل میں لسانیات بہت کار آمد ثابت ہوتی ہے لیکن اس کی ایک حد مقرر ہے اس کے بعد طلبہ اُن اصولوں سے اُلجھنے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جلد از جلد وہ اس مٹھاس سے لطف اندوز ہو سکیں جو اُن کے کانوں میں رس گھولتی رہی ہے۔ یعنی وہ اُن اشعار کو پڑھ کر اُن کا صحیح لطف لینا چاہتے ہیں۔ جو انہوں نے دوسروں کی زبانی سُنے تھے۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جیسے ہی طالب علم جملے لکھنے اور پڑھنے کے قابل ہو جائیں ہم کو انہیں ادب سے روشناس کرانا چاہیے۔

تقریباً یہی طریقہ اسماعیل میرٹھی صاحب نے اپنی کتابوں میں اختیار کیا تھا اور جیسے ہی بچوں میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی کہ انہوں نے ہلکی پھلکی نظموں سے واقفیت کرائی مثلاً۔ رب کا شکر ادا کر بھائی۔ جس نے ہماری گائے بنائی

اس قسم کی نظمیں بچوں کے لیے تو مفید ثابت ہوتی ہیں لیکن افسوس

کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ آج کے بالغاں کے کورس میں بھی اس طرح کی نظمیں شامل ہیں ان نظموں کے مطالعے سے بالغان پڑھنا تو سیکھ جاتے ہیں لیکن ان کے شعور میں کسی قسم کی بیداری پیدا نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی اُن کے مذاق کی تکمیل ہوتی ہے۔ جس کے لیے انہوں نے زبان سیکھنا شروع کی ہے۔

اس لیے میری گذارش اُن حضرات سے اتنی سی ہے جو نصاب کمیٹیوں کے ممبر ہیں کہ وہ ہلکی پھلکی آسان ترین ایسی نظمیں کا انتخاب کریں جو الفاظ اور معنی کے اعتبار سے آسان ہوں لیکن اپنے اندر گہرائی اور معنویت رکھتی ہوں۔ جو جذبات سے بھرپور ہوں جس کو پڑھ کر ایک بالغ محسوس کرے کہ ہاں اس نے کچھ پڑھا ہے اس سلسلے میں مجازؔ مرحوم کی ایک نظم "ننھی پجارن" کے چند اشعار نمونے کے طور پر نقل کر رہا ہوں۔

ایک ننھی منی سی پجارن ۔ پتلی باہیں پتلی گردن
بھور بھئے مندر آئی ہے ۔ آئی نہیں ہے ماں لائی ہے
کیسی بھولی اور سیدھی ہے ۔ مندر کی چھت دیکھ رہی ہے
ماں بڑھ کر چٹکی لیتی ہے ۔ چپکے چپکے ہنس دیتی ہے
ہنسنا رونا اس کا مذہب ۔ اُس کو پوجا سے کیا مطلب

خود تو آئی ہے مندر میں
من اُس کا ہے گڑیا گھر میں

اسی طرح یہ آسان غزلیات کو ابتدائی نصاب میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ غزل پر اس لیے بھی زور دینے کی ضرورت ہے کہ یہ اردو کی سب سے مقبول صنف ہے اور اسے پسند کرنے والوں میں عمر کی کوئی قید نہیں ہے یہ ہر عمر کے لوگوں کی ترجمانی کرتی ہے اور اُن کے معیار اور مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہے اس لیے ایسی غزلیں جو آسان اور عام فہم زبان میں ہوں ابتدائی نصاب جو ثانوی زبان کے طلبہ کے لیے تیار کیا گیا ہو شامل کی جانا چاہیے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے وہ یہ کہ ثانوی زبان کے طلبہ کے لیے جو غزلیں یا نظمیں انتخاب کی جائیں وہ جدید شعراء کی ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ یہ شعراء دورِ حاضر کی غائیدگی اس طرح کرتے ہیں کہ موجودہ مسائل کو اپنی غزلوں اور نظموں کا موضوع بناتے ہیں۔ اس طرح کی غزلیں ثانوی زبان کے بالغ طالب علموں کی زیادہ دلچسپی کا باعث ہونگی۔

اِسی طرح غزلوں کے ساتھ جاں نثار اختر اور اختر انصاری جیسے شعراء حضرات کی رباعیات کا بھی انتخاب بے جا نہ ہوگا اور اس طرح طالب علم کو ایک اور صنف سے واقفیت آسانی سے بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ رباعیات کے سرمایہ میں ایسی رباعیات کی کمی نہیں ہے جو دورِ حاضر کے حالات سے بھرپور ہیں۔ لیکن قصیدہ اور مثنوی جیسی اصناف کو ابتدائی نصاب سے

دور رکھنا چاہیئے۔ ان اصناف کا مطالعہ اسی وقت مناسب ہوگا جب طالب علم زبان پر مکمل عبور حاصل کر لیں۔

جہاں تک آسان نظموں اور غزلوں کے اقتباسات کو ابتدائی کورس میں پڑھانا ضروری سمجھتا ہوں وہ اِن اصناف کی خصوصیات اور شعراء کے کلام کی خوبیاں اور باریکیاں اُن کی زندگی کے اہم کارنامے وغیرہ جیسی چیزوں سے بھی طلبۂ کو روشناس کرانا چاہیئے۔ اِس میں طلبہ بہت دلچسپی لیتے ہیں اور اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہم بہت کچھ انہیں بتا پاتے ہیں اور تاریخ اردو ادب کے سیدھے مطالعے سے بچ جاتے ہیں۔ جن کا کلام اُن کے کورس میں شامل ہوگا وہ ان شعراء کے بارے میں بہت کچھ جان جائیں گے۔ اور جب آگے چل کر تاریخ اردو ادب کے مطالعہ کا سوال آئے گا تو وہ سب کچھ اُن کے لیے نیا نہیں ہوگا اِس سے ان کی ایک بہت بڑی اُلجھن ختم ہو جائے گی۔

نصاب کے انتخاب میں ایک اور بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ جو کچھ منتخب کیا جائے وہ بالغان کی دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ اگر میں یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ آج کل جو بالغ طالب علم اُردو سیکھنے آتے ہیں، اُن میں زیادہ تعداد ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والوں کی ہوتی ہے اس لیے چکبست کی نظم "رامائن کا ایک سین" جیسی نظمیں یا نثر کے اسی طرح کے اقتباسات شامل کرنے سے طلبہ کی دلچسپی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگوں کو اپنے علاقے سے غیر معمولی دلچسپی یا لگاؤ ہوتا ہے اس لیے ابتدائی نصاب میں ایسے مضامین یا تاریخی عمارتوں کا ذکر یا وہاں کی اہم شخصیتوں کے بارے میں کچھ اسباق اگر شامل کیے جائیں گے۔ تو وہ بھی طلبہ کی دلچسپی میں اضافہ کر سکتے ہیں، جنھیں وہ شوق سے پڑھیں گے۔

یہاں ان باتوں کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان کو پورا ادب تو پڑھانا نہیں ہے بلکہ ادب کے ذریعہ انھیں زبان سکھانا مقصود ہے اس لیے زبان میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے انھیں اچھا، معیاری اور دلچسپ انتخاب پڑھانا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی دلچسپی اور شوق کو برقرار رکھ سکیں اور آگے چل کر اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ چلتا رہے۔

اس لیے میں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ ہم جو کچھ بھی پڑھائیں وہ ہمارے طالب علموں کے معیار اور مزاج سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

اس لیے میں یہاں اس بات پر خاص طور سے زور دینا چاہوں گا کہ نثر اور نظم کے حصوں میں سے جو بھی اقتباسات لیے جائیں وہ جدید شعراء اور ادباء کے کلام میں سے ہوں تو بہت اچھا ہوگا۔ کیونکہ جدید ذہن کے طالب علم جدید شاعروں اور ادیبوں کی بات زیادہ آسانی سے سمجھ کر اور دلچسپی سے پڑھیں گے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ کلاسیکی شعراء اور ادبا کے کلام کو ہمیں بعد میں پڑھانا چاہیے۔

پہلے موجودہ دور کے شعراء و اُدباء کی چیزوں کو پڑھانا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ انتخاب کی یہ خوبی ہونا چاہیے کہ وہ مختصر ہا مختلف اور احساسات، جذبات اور افطرہ کا ترجمان بھی ہو ایک سبق یا نظم کے بعد جب طالب علم دوسرا سبق پڑھے تو اُسے تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے جذبات اور نئے احساسات کا احساس بھی ہو کہ وہ کوئی چیز اور نئے خیالات پڑھ رہا ہے۔ ورنہ یکسانیت سے وہ اکتا جائیں گے۔ مثلاً میں نے خود بہت سے غیر اُردو داں حضرات کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اردو شاعری میں عشق و محبت کے سوا کیا ہے؟ تو اس کا جواب اُس سے زیادہ اور کیا دیا جا سکتا ہے کہ یہ محض خام خیالی ہے یا بہت سے لوگ اُردو کو بدنام کرنے کے لئے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ یا انہوں نے اُردو ادب کو پڑھا نہیں ہے اور نہ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے نصاب میں جن چیزوں کو شامل کیا جائے وہ مختلف موضوعات اور فکر کی ترجمانی کرتی ہوں۔ ایسا اس لیے بہت ضروری ہے۔ ایسا انتخاب اُردو ادب کی صحیح تصویر پیش کر سکے گا، اور ثانوی زبان کے طلبہ کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ ان کے ذہن صاف ہونگے اور ان تصورات اور خیالات کو دور کرنے میں مدد ملے گی جو وہ ایک لمبے عرصے سے سنتے آرہے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے وہ خود محسوس کریں گے کہ اُردو زبان ہر لحاظ سے فکر وفن کی ترجمان ہے اور یہ کسی بھی دوسری زبان سے پیچھے نہیں ہے۔

یہاں یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ ادب کے انتخاب میں سنجیدہ

موضوعات کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مضامین کو بھی شامل کرنا چاہیئے کیونکہ مزاح ہماری زندگی کا ایک اہم جزو ہے اور ادب میں بھی اس کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اس قسم کی نظمیں اور نثری اقتباسات ثانوی زبان کے طلبہ میں خاصی دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس بات کا خیال رہے کہ مزاح بہت نازک شئے ہے اور بہت ہلکی سی جنبش سے سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے تو تعلیمی نصاب کو ابتذال سے بچانا چاہیئے۔

الغرض ادب ثانوی زبان کی تعلیم میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کے مطالعے سے ثانوی زبان کے طلبہ زبان کو زیادہ دلچسپی اور لگن کے ساتھ پڑھیں گے یہ طریقہ ساتھ ہی ان کے شوق اور مقاصد کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوگا۔ اس لیے ثانوی زبان کی حیثیت سے جہاں کہیں بھی اردو کی تعلیم دی جاتی ہے، ان سب حضرات کو چاہیئے کہ وہ ادب کے شہ پاروں کی طرف خاص توجہ دینا چاہیئے۔ میری رائے میں موجودہ دور کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کو ابتدائی نصاب میں جگہ دینے کی ضرورت ہے اور کلاسیکی شعراء کو بعد میں پڑھایا جانا چاہیئے۔ مگر ضروری ہے کہ ان تخلیقات کی زبان آسان اور سلیس ہو۔ جسے نئے طالب علم آسانی سے سمجھ سکیں۔

آج کی تعلیمی حالت

وقت بھی کیا عجیب شے ہے اور یہ بھی شعبدہ گر کی طرح سے رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور لوگ اس کے آگے سر جھکائے ہمیشہ اس تابعداری میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ تعلیم کی طرف لوگوں کی توجہ ذرا بھی نہیں تھی اور آج ہر شخص اپنے بچوں کو اسکول بھیج رہا ہے بغیر اُن کی اہلیت کا اندازہ لگائے ہوئے اور چاہتا ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور پھر اس پہ ستم یہ ہے کہ موجودہ جو تعلیمی نظام ہے اس سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آج کی تعلیم لوگوں میں حقیقی تہذیب پیدا نہیں کر رہی ہے وہ اس نئی تعلیم کو حاصل کر کے اپنی پرانی تہذیب کو بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ نئے تعلیم یافتہ بڑوں کی عزت نہیں کرتے ہیں اور مغرب کی تقلید میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے الغرض جتنے منہ ہیں اتنی باتیں ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ یہ اعتراضات درست ہوں لیکن اس کی

ذمہ داری صرف اساتذہ اور اسکول و کالجوں پہ ہی عاید نہیں ہوتی ہے درحقیقت اس سب کے لیے ذمہ دار ہیں والدین خود اور اربابِ سیاست۔

اِن بے پناہ اعتراضات کی بنا پر آج کل کے حکام کے لیے موجودہ تعلیم کا نصاب ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے کہ آخر وہ نظام تعلیم اور نصاب کو کس دھارے پر چلائیں کہ ان اعتراضات سے چھٹکارہ پایا جاسکے اور کوئی مناسب صورت سامنے آئے جو ملک اور قوم دونوں کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ آئے دن جو نصاب اور نظامِ تعلیم میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے حکام بھی اس موجودہ ڈھانچے سے مطمئن نہیں ہیں۔

پرانا طریقہ جو رائج تھا وہ 2 + 2 + ۱۰ تھا اُسے جب تبدیل کیا گیا تو بیچ میں سے انٹرمیجیٹ غائب ہو گیا اور اُس کا ایک سال میٹرک کے ساتھ جوڑ کر ہائر سکینڈری کہا گیا اور ایک سال بی اے میں ملا کر بی اے کو تین سال کا کر دیا گیا۔ جب اس سے بھی بات نہیں بنی تو 3 + 2 + ۱۰ کے طریقے کو لاگو کیا جا رہا ہے اور اس سے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کے تحت تمام بورڈ اور یونیورسٹیاں اپنے اپنے علاقے کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نصاب ترتیب دے رہی ہیں۔

اس طرح اگر ہم پورے ملک کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو ہمیں یکسانیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ کوئی انگریزی میں تعلیم دے

رہا ہے تو کوئی ہندی میں تو کہیں علاقائی زبانوں پر زور ہے کسی کا نصاب سخت ہے تو کسی کا کمزور، کہیں کسی چیز کو اہمیت دی گئی ہے تو کہیں کسی دوسری چیز پر زور ہے۔

ان سب وجوہات کی بنا پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ تعلیم کا حقیقی زندگی سے رشتہ بہت ٹوٹا ہوا ہے۔ نصاب میں کتابوں کی تو بھرمار ہے لیکن وہ کوئی اچھا ذہن پیدا کرنے والا مواد مہیا نہیں کر پا رہی ہیں۔ رٹنے اور یاد کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے بچوں میں خود کچھ سیکھنے یا کہنے کی صلاحیت کی طرف کوئی توجہ دینے کا خانہ نہیں ہے جس سے وہ اپنی صلاحیتوں کو بڑھا سکیں اور ایک اچھے شہری بن سکیں یا اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے آپ کو لائق سمجھ سکیں۔ ان سب چیزوں کی بنا پر وہ کلرک سے زیادہ کچھ اور بننے کے اہل نہیں ہو پاتے ہیں۔ آج کل نصابوں میں کوئی تال میل بھی دیکھنے کو نہیں ملتا ہے کیونکہ تمام مضامین کو گروپوں میں بانٹ دیا جاتا ہے جس سے طالب علم کو اپنی مرضی کے مضامین کے انتخاب میں دشواری ہوتی ہے اور وہ ایسے مضامین پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس میں اس کی دلچسپی ذرا بھی نہیں ہوتی ہے۔ جو اس کی ترقی میں رکاوٹ کا باعث بن جاتے ہیں۔

بچوں کی تعلیم میں مندرجہ بالا وجوہات رکاوٹ بننے کے ساتھ کتابوں کا بوجھ اور والدین کی سختی کہ پڑھو اور سائنس پڑھو بغیر

سوچے سمجھے کہ ان کے بیٹے یا بیٹی کی ذہنی سطح کیا ہے۔ کیا وہ اس لائق ہے کہ سائنس پڑھ سکے گا یا نہیں۔ اِس طرح کے بچوں میں بہت سے بچوں کا ذہن اِس قابل بھی نہیں ہوتا ہے کہ وہ آرٹ کے محنت طلب مضامین پڑھ سکیں اُن پر سائنس اور حساب لاد دی جائے تو پھر آپ خود ہی سوچئے کیا ہوگا۔ والدین کی سختی، کتابوں کا بوجھ ضرورت سے زیادہ ہوم ورک۔ اسکولوں میں اساتذہ حضرات کی لاپرواہیاں۔ گھر پر والدین کا بچوں پر توجہ نہ دینا وغیرہ جیسی باتیں اُن کے ذہن کو روک دیتی ہیں وہ بس رٹنے اور بغیر سوچے سمجھے کتابوں کے کیڑے بن جاتے ہیں اُن کی معلومات میں اضافہ نہیں ہوتا ہے۔

اس طرح کی خرابیاں جو آج کے ہمارے تعلیمی نظام کا ایک جز بن کر رہ گئیں ہیں، وہ بچوں کو کسی دھارے پر لے جانے کے بجائے ایک خودرو درخت سا بنا دیتی ہیں جس کی دیکھ بھال کرنے کو کوئی مالی نہیں ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے جدھر چاہتا پھلتا ہے بڑھتا ہے اس طرح بہت سے بچے ہاتھ پیر مار کر کچھ بن جاتے ہیں اور کچھ بگڑ جاتے ہیں۔

بہر حال اب ضرورت ہے ایک ایسے جدید تعلیمی نظام اور نصاب کی جو بچوں میں جسمانی، اور اخلاقی اور ذہنی و دماغی تربیت اس طرح سے کر سکے کہ وہ اچھے شہری بن سکیں۔ سماج کی اعلیٰ قدروں کی قدر کریں تاکہ ہمارے ہندوستان کا معاشرہ ایک باشعور سماج کو جنم دے سکے۔ جس میں اتحاد و اشتراک کا جذبہ بچوں میں پیدا ہو اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے بجائے مل جل کر رہنا سیکھ سکیں۔ اونچ نیچ کی

تفریق ہندو مسلمان۔ سکھ اور عیسائی وغیرہ کے انداز میں سوچنے کا جو رویّہ ہے اِس میں تبدیلی آئے اور سب ہندوستانی کی حیثیت سے مِل جُل کر کام کریں۔ اچھے بُرے کی تمیز کر سکیں۔ اپنے فرض کو سمجھیں۔ دوسروں کے جذبات کا احترام کر سکیں ساتھ ہی اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار بے جھجک کر سکیں۔ فرصت کے اوقات کا صحیح استعمال کریں ان میں زیادہ مطالعے کا شوق پیدا ہو جیسی خصوصیات ایک طالب علم میں پیدا کرنے کے لیے ایک اچھے نصاب کی ضرورت ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ جس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ استاد صاحبان اپنے رویّہ کو بھی بدلیں اور اُن کا جو انداز پڑھانے کا ہے اِس میں تبدیلی لائیں یعنی پڑھانے کے علاوہ اب یہ ضروری ہو گیا ہے استاد صاحبان اپنے شاگردوں کے قریب بھی آئیں اور جو پرانی اور روایتی دیوار استاد اور شاگرد کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھی اُسے گرا دیں اور ایک دوسرے سے گھُل مل جائیں۔ پڑھائی کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی وہ بحث کریں، باتیں کریں اور استاد انہیں اُن کی طبیعت اور مزاج کے مطابق مشورہ دیں۔ یہ کام استاد سے بہتر کوئی دوسرا اس لیے نہیں کر سکتا ہے کہ وہ اُن کے زیادہ قریب رہتا ہے۔ وہ اپنے طالب علم کے مزاج کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور اُسے آگے پڑھنے اور مضامین کے انتخاب میں مدد دے سکتا ہے۔ اس طرح اعلیٰ تعلیم کی راہیں ہموار ہو سکیں گی۔ اور استاد صرف استاد نہ رہ کر ایک رہنما مددگار اور دوست کی حیثیت

سے جب طلبہ کو ان کی نفسیات سمجھ کر چلائے گا تو وہ یقیناً صحیح راہ اختیار کریں گے۔ ساتھ ہی انہیں قول و فعل کی آزادی بھی ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے دل کی بات اپنے استاد کو بتا سکیں۔ انہیں بات بات پر ٹوکنا یا روکنا نہیں چاہیئے اس سے اُن میں جھجک پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ کھل کر کوئی بات نہیں کر پاتے ہیں۔

الغرض آج کا نیا نصاب اور نظام تعلیم ہو یا پرانا دستور ہر زمانے میں استاد کو اہمیت حاصل رہی ہے اور رہے گی۔ ذرا سوچیئے ایک زمانہ وہ تھا جب بچوں کے دماغ میں زبردستی خیالات کو ٹھونسنے کا نام تعلیم تھا تو اس وقت بھی یہ کام استاد ہی کرتے تھے اور آج کے میل جول کے طریقے میں استاد کا ہی رول سب سے اہم ہے، اسی کے ساتھ والدین کی ذمہ داری بھی کسی طرح سے کم نہیں ہوتی ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ رات کو ضرور اُن کا ہوم ورک کرنے میں مدد کریں اور ان میں قوتِ فیصلہ پیدا کریں اُن کی ضروریات کا خیال رکھیں تب ہی جدید نظامِ تعلیم کامیاب ہو سکتا ہے۔

نظامِ تعلیم کے سُدھار کی ضرورت

آزادی کے ۳۳ سال پورے کرنے کے بعد بھی ہمارے تعلیمی نظام میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اب تک اسی پرانے انداز سے تعلیم دی جارہی ہے۔ جس میں اسباق کو رٹنے اور امتحان کے عمل کو ہر سال دہرایا جاتا ہے۔ اگر امتحان میں تقدیر نے زور مارا تو تیس مار خان بن گئے اور مونچھوں پر تاؤ دینے لگے ورنہ جہاں کے تہاں ـــــ ؟ اس طرح ڈگریاں حاصل کرنے کے علاوہ طالب علموں کے ہاتھ میں کچھ نہیں آتا ہے۔ البتہ چند علمی باتیں ضرور دماغ میں بھر جاتی ہیں لیکن وہ عملی زندگی میں اس سے خاص فائدہ نہیں اٹھا پاتے ہیں

آج کل کے تعلیمی نظام میں طالب علموں پر کتابوں کا بوجھ سب سے زیادہ ہے۔ ان میں سے چند اسباق وہ امتحان کی خاطر رٹ لیتے ہیں۔ اس سے اُن میں اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت

پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ دوسروں کی نقل کا مادہ جاگ اٹھتا ہے پھر کورس بھی کچھ اس طرح سے ترتیب دیئے گئے ہیں کہ ان میں ماضی کے واقعات پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور عہدِ حاضر کی حقیقتوں سے جن سے طالب علم کو آئے دن واسطہ پڑتا رہتا ہے، کورس کی صورت میں سمجھنے اور پڑھنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔

الغرض موجودہ تعلیم اصل غرض و غایت سے بہت دور ہے، جو ہماری تہذیب و تمدن اور روزمرہ کی زندگی کو پیش کرنے کے لیے بہت ناکافی ہے بس پرانے واقعات کو دہرایا جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہمارے نوجوانوں کی ذہنی قوتوں کی پرورش نہیں ہو پاتی ہے، اور شخصی نشو و نما میں بھی کمی رہ جاتی ہے۔

مضامین کی کثرت کی وجہ سے طالب علم کو اپنے مزاج اور مذاق کے مطابق مضامین کے انتخاب میں بھی بہت دشواری پیش آتی ہے۔ ایک کلاس کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کلاس۔ غرض صبح سے شام تک طالب علم ایک مضمون کی کلاس میں جا بیٹھتا ہے اور اسے ذرا بھی اپنے مضمون کے متعلق سوچنے کا موقع نہیں ملتا ہے نہ ہی کوئی استاد اس سے یہ دریافت کرتا ہے کہ اس کی دلچسپی کس مضمون میں ہے کونسا مضمون اُسے آسان لگا یا اُسے حساب کیوں مشکل لگا وغیرہ وغیرہ

غرض اُسے مہلت ہی نہیں ملتی ہے کہ وہ سوچ سکے یا کہہ سکے۔

اگر کوئی طالب علم اپنے اختیاری مضامین میں، اپنا پسند کا مضمون لینا بھی چاہتا ہے تو نصاب کچھ اس طرح سے الجھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ ایک مضمون لیتا ہے تو دوسرے اپنی پسند کے مضامین سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

پھر ہمارے تعلیمی نصاب ملکی، سماجی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ اخلاقی تعلیم کی حالت اور بھی خراب ہے اب تو طالب علم آئے دن اساتذہ کی بے عزتی کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو بدلنے کی سخت ضرورت ہے اور اسے بدل کر کچھ اس طرح سے ترتیب دینا ہوگا جس میں اخلاقی تعلیم، اختیاری مضامین کی زیادہ سے زیادہ سہولت مہیا کی جائے ساتھ ہی ساتھ انہیں ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جہاں وہ اپنی پسند کا اظہار کر سکیں اور تین ماہ کے بعد بھی وہ اپنی مرضی سے مضامین بدل سکیں۔ تب ہی ان کی شخصیت ابھرے گی اور وہ کچھ بن کر دکھا سکیں گے۔ ایسے طالب علم جو اپنی مرضی کے مطابق مضامین پڑھیں گے وہ اپنے میدان کے زیادہ ماہر ہونگے اور وہ ہمارے سماج کے لیے بھی بہتر فرد کا ثبوت دے سکیں گے۔

الغرض موجودہ تعلیمی نظام کی از سر نو تشکیل کی سخت ضرورت ہے۔ اس پر ہماری سرکار کو خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ادب اور معاشرت

ادب اور معاشرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے معاشرت، تہذیب و تمدن کو ہم ادب کے ذریعہ ہی پہنچا نتے ہیں اور اس کے پھیلانے اور ترقی دینے میں ادب کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے اس کی بہترین مثال آج کے مشنری اسکول ہیں، جن کی نصابی کتابوں میں ہندوستانی معاشرے سے متعلق اسباق نہ ہونے کے برابر ہیں اور ان کی جگہ پر عیسائیت کا پرچار اور انگریزی تہذیب تمدن سے متعلق بہت زور دیا گیا ہے، جس کے نتیجہ میں ہندوستانی بچے اپنے مذہب اور معاشرت سے واقف ہونے کے بجائے عیسائیت سے زیادہ واقف ہو جاتے ہیں۔ انگریزی تہذیب ہی ان کے لیے سب کچھ ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اس کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان کی وہ ملی جلی تہذیب جو دو قوموں کے ملنے سے وجود میں آتی ہے، جس کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی وجود میں آئی اب اردو زبان کی طرح وہ بھی گوشہ نشین سی ہوتی جا رہی ہے ابھی اس تہذیب سے

وہ لوگ تو واقف ہیں جو اردو ادب سے واقف ہیں۔ باقی دوسرے حضرات کے لیے وہ تہذیب جسے گنگا جمنی تہذیب کہا جاتا ہے بالکل پرائی سی چیز ہو کر رہ گئی ہے وہ نہیں جانتے کہ آداب کے کیا طریقے ہیں۔ کھان پان اور بات چیت کرنے کے کیا انداز ہیں اردو نے جس ہندوستان کو ایک کر دیا تھا اور جو زبان سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اُس نے سب کو ایک تہذیب و تمدن میں باندھ دیا تھا لیکن آج اُسی اردو کو نقصان پہنچا کر سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اب بنگالی صرف بنگالی تہذیب سے واقف ہے تو مدراسی صرف مدراسی تہذیب سے واقف ہے اسی طرح پورا ہندوستان جو ایک ڈور میں بندھ گیا تھا اب پھر منقسم ہو کر اپنے آپ میں محدود ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو پڑھائی جائے اور اس کی نصابی کتابوں میں ایسے اسباق شامل کیے جائیں جو اردو کی تہذیب و تمدن سے متعلق ہوں تاکہ ایک بار پھر اردو جاننے والے حضرات اپنی پرانی تہذیب سے واقف ہو سکیں اور ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔

زبان کا تعلق کسی نہ کسی تہذیب سے ضرور ہوتا ہے وہ اسی تہذیب کے دائرے میں پھولتی پھلتی ہے اس لیے زبان اور تہذیب کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے اس کے ایک ہی جملے سے اس کے تہذیبی ماحول کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اردو کا تعلق ہندستان

کی گنگا جمنی تہذیب سے ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جنم لیتی ہے جس میں ہر مذہب اور ملک و قوم کے کچھ نہ کچھ عناصر موجود ہیں۔ یہ تہذیب ہندوستان کا تاج ہے اسے سب پسند کرتے ہیں اس کے سب ہی دلدادہ ہیں اس لیے اردو زبان سیکھنے کے ساتھ یہ بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ آپ اس تہذیب سے واقف ہوں۔

اب تک اِس زبان میں جو ادب لکھا گیا ہے یقیناً وہ اُس تہذیب کا علمبردار ہے۔ جب تک اس میں معاشرے کا ذکر نہ ہو وہ ادب مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس طرح ادب اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو گئے ہیں۔ اور اس لیے کہا جاتا کہ اگر کسی معاشرے کو سمجھنا ہو تو اس کے ادب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اس لیے اردو کے ابتدائی درجات میں اس طرح کے اسباق کا ہونا بہت ضروری ہے جو ہمارے معاشرے اور اس کی تہذیب و تمدن سے تعلق رکھتے ہوں۔ تب ہی ابتدا سے ہمارے طالب علم اپنی تہذیب اور اس کے ماحول سے واقف ہو سکیں گے۔

"اردو میں درسی کتابوں کی ضرورت"

تعلیم بالغان یا ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں جو بھی اقدامات کیے گئے ہیں وہ ابتدائی درجات سے تعلق رکھتے ہیں میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک زیادہ زور صرف زبان سکھانے پر ہے اور بات صرف قاعدے سے آگے نہیں چلی ہے۔ اس لیے جب کتابوں کے سلسلے میں ذرا بھی غور کیجیے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اردو میں قاعدے تو بہت تیار کیے جا چکے ہیں لیکن اس سے آگے کے مراحل کے لیے کوئی مناسب کتاب ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی ہے جسے Text Book یا درسی کتاب کا درجہ دیا جا سکے اور جو ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھنے والے طالب علموں کی ضروریات کو پورا کرتی ہو۔

حالانکہ اردو زبان میں کتابوں کی کمی نہیں ہے لیکن جب ہم بالغان
کے مطالعے کے نقطۂ نظر سے ان پر انتخاب کی نظر ڈالتے ہیں تو کوئی
بھی کتاب اِس لحاظ سے مناسب معلوم نہیں ہوتی جسے نصاب
میں داخل کیا سکے ۔ ان لاتعداد کتابوں میں سے یقیناً بہت سی
کتابیں اِس قابل ہیں جو کسی ثانوی زبان کے کورس میں داخل کی
جاسکتی ہیں لیکن ایک سوال یہ ہے کہ یہ آج کی ضروریات اور
لسانی اصولوں کی پابند نہیں ہیں اس لیے ہمارے معیار پر پوری
نہیں اُترتی ہیں ہیں اور اس لیے ہم ان کے انتخاب سے گھبراتے
ہیں ۔ کیونکہ جن لسانی اصولوں کے تحت انہیں زبان سکھائی
جاتی ہے ضروری ہے کہ ان ہی اصولوں کو بعد کی کتابوں میں برتا جائے
ورنہ طالب علموں کو پڑھنے میں بہت پریشانی ہوتی ہے ۔

یہاں میں یہ بات واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بالغان
سے میری مراد ان طالب علموں سے ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں
اور اب انہیں اردو سیکھنے کا موقع ملا ہے اس لیے ضروری ہے۔
کہ ایسے طالب علموں کے لیے جو کتاب منتخب کی جائے وہ معیاری
ادب سے مالامال ہو ۔ اسباق کا انتخاب دلچسپ اور بالغان
کے لحاظ سے کیا جائے ۔ اسباق طویل نہ ہوں ۔ اور نہ ہی
اتنے مختصر ہوں کہ بات بھی پوری نہ کہی گئی ہو ۔ تمام مشکل
الفاظ پر اعراب کا ہونا بہت ضروری ہے ۔ مرکب الفاظ سے

پرہیز کیا گیا ہو۔ کتابت موٹے قلم سے اور صاف چھاپی گئی ہو وغیرہ وغیرہ ایسی چیزیں جو ایک ثانوی زبان کے طالب علیم کی درسی کتاب کے لیے ضروری ہیں۔

ان ہی چیزوں کے فقدان کی وجہ سے آج جتنی کتابیں دستیاب ہیں وہ ثانوی زبان کی تعلیمی نصاب میں شامل نہیں کی جا سکتی ہیں ہندوستان میں ایک نہیں کئی ادارے ایسے ہیں جو بالغان کی تعلیم کے سلسلے کام کر رہے ہیں اور ان سب نے اپنے اپنے طور پر اردو کے قاعدے تیار کر لیے ہیں لیکن اس سے آگے تو کوئی درسی کتاب جیسے درسی کتاب کہا جائے ابھی تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ حالانکہ اب تعلیم بالغان ابتدائی درجات سے بہت آگے نکل آئی ہے اور ہمیں سختی سے ایسی اچھی اور معیاری کتابوں کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

مختلف اداروں کے علاوہ بہت سی یونیورسیٹیز میں بھی اردو ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہے جس میں شوقیہ اردو سیکھنے والے طالب علموں کے علاوہ اساتذہ، وکلاء اور تجارت پیشہ اصحاب بھی داخلہ لیتے ہیں۔ ان کورسس کے امتحانات یونیورسٹی کے طریقۂ کار کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ تمام طالب علم بالغ سمجھدار اور باشعور ہوتے ہیں۔ ان کے نصاب میں کسی بھی کتاب کو شامل کرنے کا مسئلہ ایسا اہم

ہے جسے آسانی سے ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر کونسی کتاب ایسی ہے جو ان کے معیار اور مذاق کی ترجمانی بن کر ان میں اردو پڑھنے اور لکھنے کا شوق کو برقرار رکھ سکے گی۔

اس سلسلے میں ایک بہت عجیب اور حیران کن چیز جو دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ بہت سی جگہ پر بچوں کے لیے تیار کردہ کتابیں کورس میں داخل ہیں ہے یہ ضرور ہے کہ یہ کتابیں موٹے قلم سے لکھی گیئں ہیں۔ عام فہم الفاظ کا استعمال ہے چھپائی بھی صاف ہے ۔ لیکن اِن کتابوں میں اسباق کا معیار بچوں کی مناسبت سے تو ٹھیک ہے لیکن بالغان کے لیے مناسب نہیں ہے ۔ دوسرے یہ کہ یہ کتابیں بھی اعراب سے خالی ہیں جس کے نتیجہ میں طالب علموں کو الفاظ جوڑ کر پڑھنے میں دقت پیش آتی ہے اس لیے اکثر وبیشتر یونیورسٹی کے طالب علم جلد اس سے اکتا کر اردو سیکھنے اور پڑھنے کا خیال ترک کر دیتے ہیں۔

بعض کتابیں مکتبہ جامعہ نے شائع کیں ہیں جن کے اسباق بالغان کے مذاق اور مزاج کے مطابق ہیں لیکن ان میں عام فہم زبان کا فقدان ہے۔ عربی ، فارسی کے ثقیل الفاظ اسباق کو اس قدر بوجھل کر دیتے ہیں کہ طالب علم اکتاہٹ محسوس کرنے

لگتا ہے حالانکہ اردو ادب کا زیادہ حصہ آسان زبان میں لکھا گیا ہے لیکن نہ جانے کیوں کتابوں میں انتخاب کے وقت کلاسیکی یا پرانے لکھنے والوں کے مضامین کو جگہ دینے پر ترجیح دی جاتی ہے اور وہ لوگ سب کے سب فارسی اور عربی سے زیادہ متاثر تھے اس لیے جگہ جگہ اپنی تحریروں میں فارسی اور عربی کے الفاظ کا برجستہ استعمال کرتے تھے یہ کام بہت زیادہ مشکل نہیں ہے، سوال ہے صرف انتخاب کا اور اسے ترتیب دینے کا جو کوئی مشکل کام نہیں ہے اِن اسباق کو اگر انتخاب کرنے سے پہلے اگر ایک بار غور سے پڑھ لیا جائے اور بہت سے ثقیل الفاظ کو اگر نکال بھی دیا جائے تو تحریر میں کچھ فرق نہیں پڑتا ہو تو نکلا بھی جا سکتا ہے تاکہ انتخاب اور ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔

اس لیے میں اُن تمام اداروں سے درخواست کرتا ہوں کہ جو درسی کتابوں کی تیاری میں مصروف ہیں وہ ثانوی زبان کے لیے ایسی کتابیں تیار کریں جن میں مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھا جائے۔

۱۔ کتاب کا معیار بالغان کے مزاج کے مطابق ہو

۲۔ اسباق آسان اور عام فہم زبان میں ہوں

۳۔ ثقیل الفاظ سے گریز کیا جائے۔

۴۔ اسباق مختصر ہوں

۵۔ طویل اسباق جوں جوں معیار بڑھتا جائے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

۶ - مشکل الفاظ کے ساتھ ساتھ اِس، اُس ان، اَن وغیرہ پر اعراب کا استعمال کیا جانا بہت ضروری ہے۔

۷ - ابتدائی اسباق موٹے قلم سے لکھے جائیں۔

۸ - ایک الفاظ اور دوسرے الفاظ کے درمیان کچھ فاصلہ ضرور ہو۔

۹ - بہت سے الفاظ کو جنہیں اکثر لوگ ملا کر لکھ دیتے ہیں انہیں الگ الگ ہی لکھا جانا چاہیئے۔ مثلاً آپکا - آپ کا آپکی - آپ کی۔ ہمسفر - ہم سفر وغیرہ وغیرہ

۱۰ - دھیرے دھیرے قلم باریک کرتے جانا چاہیئے اور ایک الفاظ سے دوسرے الفاظ کے بیچ میں فاصلہ بھی کم کرتے جانا چاہیئے۔

۱۱ - نثر کے علاوہ نظمیں اور غزلیں خاص طور پر کتاب میں شامل کرنا چاہیئے، جن میں آسان اور عام فہم زبان استعمال کی گئی ہو۔

۱۲ - اسباق کا استعمال مختلف موضوعات کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ مثلاً ادبی موضوعات کے ساتھ سائنس، کھیل اور تہذیبی و معاشرتی اسباق کا انتخاب ضروری ہے۔

۱۳ - ابتدائی اسباق آسان اور دلچسپ ہوں اور پھر دھیرے دھیرے مشکل الفاظ کے ساتھ ساتھ اسباق کا معیار بلند کرنا چاہیئے۔

۱۴ - ہر سبق کے آخر میں مشق کا ہونا بہت ضروری ہے مشق میں سوالات کو یکسانیت سے بچانا ہوگا ہر سبق کی مشق کو مختلف قسم کے سوالات سے آراستہ کرنا چاہیئے۔

اس طرح ایک نہیں کئی کتابیں تیار کرنے کی ضرورت ہے
جو درجہ بہ درجہ معیار کو بلند کرنے والی ہوں تاکہ ایک کتاب کے بعد
دوسری کتاب طالب علموں کو شروع کرائی جائے اور ہر کتاب کا
انتخاب بہتر سے بہتر ہونا چاہیئے جو ان کے معیار اور مذاق کی
غمازی کرتا ہو تاکہ ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو سیکھنے
والوں میں زیادہ استعداد پیدا ہو سکے اور وہ پھر دوسری
کتابیں، اخبار اور رسائل آسانی سے پڑھ سکیں۔

اس طرح کی کتابوں سے جہاں لاتعداد فائدے ہونگے
وہاں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ طالب علموں میں پڑھنے
کا شوق برقرار رہے گا اور تمام طالب علموں کا معیار یکساں
ہوگا چاہے وہ کسی بھی ادارے یا یونیورسٹی میں تعلیم
پا رہے ہوں۔

اردو تعلیم کا مستقبل اور منصوبے

جو زبان آج سے چار سو سال پہلے اس سرزمین میں پلی، بڑھی، پروان چڑھی اور تمام تر ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی اپنے عروج پر پہنچ کر اس نے ہندوستان کو ایک ڈور میں باندھ کر آزادی دلائی، آج اسی زبان کے لیے اس کی ہی سرزمین میں، اس کی تعلیم اور مستقبل کا سوال ہمارے سامنے آکھڑا ہوا ہے اور ہم سب کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

وقت کا دھارا ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ اور کوئی بھی شخص اُسے نہیں روک سکتا ہے اور مصلحت بھی اسی میں پوشیدہ ہے کہ وقت کے ساتھ چلو۔ خدانخواستہ اس سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ زمانے کی آواز سے آواز ملاؤ اور اپنی زبان اور اس کے تعلیمی مسائل کو بھول جاؤ۔ لیکن آنکھیں بند کر کے نعرے بھی نہیں لگانا چاہیے کہ ہندوستان کا ہر کام

اُردو زبان میں ہونا چاہیئے ۔ میں مانتا ہوں کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ اس زبان میں ہر قسم کا کام کاج کیا جاسکتا ہے ہر قسم کے مضامین پڑھائے جاسکتے ہیں لیکن اس طرح کی آواز بلند کرنے سے پہلے ہمیں حالات کا جائزہ لینا ضروری ہوگا اور انہیں مدنظر رکھنا بھی ہوگا۔

آج جن ریاستوں کو ہندی زبان کی ریاستیں کہا جا رہا ہے درحقیقت وہ اُردو کی ریاستیں تھیں (قانونی طور پر آزادی سے پہلے) جہاں کا بچہ بچہ بغیر کسی امتیاز و تفریق کے آج بھی اردو بولتا ہے ۔ لیکن وہی اردو وقت بدلتے دھارے کے ساتھ ہندی ہوگئی اور سمجھدار لوگوں نے جو اُردو اور ہندی کی تفریق کو مٹانے کے در پے تھے اسے ہندوستانی کا نام دے دیا ستم بالائے ستم پھر کہا گیا کہ اس ہندوستانی کو دیو ناگری رسم الخط میں لکھنا چاہیئے ۔ تاکہ اُردو کا نام اور اُردو زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے ۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ سب چالاکیاں کام نہ آئیں ۔ اُردو زبان اپنی جگہ اٹل رہی ۔ اُردو جو عوام کی زبان ہے جس میں ہر زبان کے الفاظ موجود ہیں ۔ آج بھی ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔

دراصل ہندی اور اُردو ایک ہی زبان کی دو شاخیں ہیں ۔ ہندی پر سنسکرت کا زیادہ اثر ہے تو اردو نے فارسی کا زیادہ اثر قبول کیا ہے ایسا کیوں اور کیسے ہوا ۔ یہ ایک اہم سوال ہے ۔

میرے خیال میں آپ سب ہی حضرات اِس کی تاریخ سے واقف ہونگے لیکن پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ جس وقت اُردو زبان اپنے ابتدائی مدارج طے کر رہی تھی۔ اس وقت ہندوستان پر ایرانی حکمرانوں کا دور دورہ تھا، جن کی مادری زبان فارسی تھی، اس لیے اردو نے فارسی کا اثر قبول کیا اور فطری طور پر اس وقت جو رسم الخط رائج تھا وہی اُردو نے اختیار کر لیا۔

آزادی کی جد و جہد میں جتنا اہم رول اُردو زبان نے ادا کیا ہے شاید ہی کسی زبان نے کیا ہو۔ لیکن آزادی کے بعد سب سے زیادہ نقصان اسی زبان کو اٹھانا پڑا! ملک کے چند دشمن عناصر نے اسے صرف مسلمانوں کی زبان کہا اور نئی نسل کے ذہنوں کو زہر آلود کر دیا جبکہ یہ خالص ہندوستانی زبان ہے، اس پر سب سے زیادہ حق ہندوستانیوں کا ہے کیونکہ یہ یہاں پیدا ہوئی ہے۔

الغرض ایک لمبے عرصے تک گمنامی کے گوشے میں پڑی رہی لیکن چند اردو کے دلدادہ اسے ہمیشہ اپنے سینوں سے لگائے رہے اور اپنے خیالات و جذبات کا اظہار شاعری، افسانے، ناول وغیرہ کے ذریعہ کرتے رہے تاکہ زبان کی گرمی برقرار رہ سکے۔

لیکن اس کے بعد بھی دن بہ دن رسائل کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ لیکن ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے ہمت نہیں ہاری، وہ برابر لکھتے رہے کیونکہ یہی وہ واحد زبان ہے جس میں جن اپنے خیالات

کو پیش کر سکتے ہیں ۔ جو اُن کے جذبات کی ترجمانی کے لیے بہترین زبان ہے۔

اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کی مادری زبان اُردو ہے اُن کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو کم از کم میٹرک تک ضرور اُردو پڑھائیں۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے خود بخود ان کے دماغ میں اردو پڑھنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اور ایک بہت بڑی تعداد بی اے اور ایم اے کی سطح پر اردو کو بحیثیت ایک مضمون کے اختیار کر لے گی۔

لیکن وہ طالب علم جو میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں یا ٹکنیکل لائن اختیار کر لیتے ہیں کم از کم اپنی مادری زبان اور ادب کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات تو حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ ابتدائی درجات میں اردو کی تعلیم ان کے ذوق و شوق کو برقرار رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگی۔ ان سب لوگوں کا اردو جاننا اور اس کے ادب سے واقف ہونا اس لیے بھی ضروری ہے۔ کہ اردو زبان سے ہمارا معاشرتی رشتہ بہت گہرا ہے۔

لیکن اب ہم کو اپنا طریقہ بدلنا ہوگا۔ اب پرانے انداز اور قدریں بدل رہی ہیں اس لیے ضروری ہوتا جا رہا ہے کہ طریقۂ تعلیم میں بھی تبدیلی کی جائے۔ جابر مولویوں کے ہاتھوں سے اردو کو نجات دلا کر نئے اور مہذب استاد کو جگہ لینی ہوگی۔

اور تعلیمی انداز کو دلچسپ اور دلکش بنانا ہوگا۔ موجودہ لسانی طریقے اختیار کرنا ہونگے جو دوسری زبانوں میں رائج ہیں تاکہ بچوں میں اُردو سیکھنے کا شوق پیدا ہو۔ فلم۔ ٹیپ رکاڈ۔ لینگویج لیب کے علاوہ مشاعرے بیت بازی شام افسانہ اور ڈراموں کے ذریعہ ہم کو تعلیمی فضا کو ہموار اور خوشگوار بناتے ہوئے بچوں اور بالغوں کو اُردو زبان کے سیکھنے کی طرف مائل کرنا ہوگا۔

جن طالب علموں کی اُردو مادری زبان ہے ان کے نصاب میں کلاسیکی ادب کو ضرور شامل کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ادب معاشرے اور سماج کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ زبان میں دلچسپی رکھنے یا پڑھانے کا ایک بہترین ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

بہت سے لوگ ایک بہت بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ اُردو کو صرف شعر و شاعری کی زبان سمجھتے ہیں اور اس کے مطالعے کو شعری مطالعے تک محدود کر لیتے ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے اردو کا شعری سرمایہ بہت وافر ہے لیکن یہ نہیں کیا جا سکتا کہ نثر ہے ہی نہیں۔ بالکل غلط ہے اُردو ادب کا نثری سرمایہ بھی بہت قیمتی ہے۔ اس لیے نصابات کو اس طرح سے ترتیب دینا چاہیئے کہ اس میں نثر و نظم دونوں حصے ہوں لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ نثر حصہ پہ زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ آج بھی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو زبان اور

اس کی تعلیم کا مستقبل روشن ہے اور یہ حیاتِ جاودانی حاصل کر لے گا اور ہمیں ان تمام موضوعات پر غور و فکر کرنے یا سیمینار کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ اگر ہم صرف یہ طے کرلیں کہ ہر وہ بچہ جس کی مادری زبان اردو ہے وہ میٹرک تک اردو ضرور پڑھ سکا چاہیے وہ ایک مضمون کی صورت میں ہو یا میڈیم کی صورت میں وہ تمام مضامین اردو میں پڑھے اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو زبان قیامت تک زندہ رہے گی اور دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گی۔

اگر ہم اردو کو سرسبز و شاداب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں کوشش ہو گا۔ اب تک یہ فخر ہماچل پردیش اور بہار اور مغربی بنگالی کو حاصل ہے جہاں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے۔

کو ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ اب دن بہ دن غیر اردو داں حضرات میں اردو سیکھنے کا شوق بڑھتا جارہا ہے۔ اور وہ زہر جو آزادی کے بعد پھیلا تھا اور اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہا جاتا تھا اس میں قدرے کمی آئی ہے اس میں ہماری سرکار نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ جگہ جگہ اردو ادارے قائم کر کے، اردو ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کر کے زبان کو دوبارہ زندہ کرنے میں بھی اس سے بہت مدد ملی ہے۔

خاص طور پر یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ ہندی اور پنجابی زبانیں جاننے والے حضرات میں اُردو سیکھنے کا شوق بہت تیز ہے بہ نسبت دوسری زبانیں جاننے والوں کے۔ ان دونوں زبانوں کے جاننے والوں کو اُردو سیکھنے میں بہت دقت پیش نہیں آتی ہے بس ان کو تو اصل میں رسم الخط سیکھنا ہوتا ہے جو دس یا پندرہ دن میں سیکھ جاتے ہیں۔ جوں جوں اُن کا مطالعہ بڑھتا ہے وہ زبان پر عبور حاصل کرتے جاتے ہیں البتہ املا کی پریکٹس برابر جاری رکھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ یہ حضرات "ت" "ط"۔ س۔ ص اور ث جیسے ہم آواز الفاظ کے فرق کو ابتدا میں محسوس نہیں کرتے ہیں اس لیے ہجے کی غلطیاں بہت کرتے ہیں لیکن پھر بھی تھوڑی سی محنت سے اُردو سیکھ جاتے ہیں۔ لیکن ہم آواز حروف کے لکھنے اور مرکب الفاظ کے پڑھنے میں انہیں خاصہ وقت لگ جاتا ہے اور اس چیز کو املا لکھوانے سے دُور کیا جا سکتا ہے اسی طرح مرکب الفاظ بھی وہ بار بار کی ریڈنگ پریکٹس سے پڑھنے لگتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان بالغان کے لیے جو درسی کتابیں تیار کی جائیں وہ مرکب الفاظ سے خالی ہوں۔ اعراب کا استعمال اُن میں ضرور کیا جائے۔ جس سے وہ اُردو آسانی سے لکھ اور پڑھ سکیں گے۔

بعض وقت اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ اُردو زبان کو بھولے نہیں ہیں۔ اس کی دل کشی انہیں گُدگداتی رہتی ہیں اور وہ زبان سیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اس لیے ہم اُردو والوں کا یہ فرض بن جاتا ہے کہ ہم اُردو کی تعلیم کا ایسا انتظام کریں۔ جہاں ثانوی زبان کی حیثیت سے طالب علم اُردو سیکھ سکیں۔ اس لیے نصاب کو دوبارہ ترتیب دینا ہوگا نئے سرے سے اُردو کی ابتدائی کتابیں لکھنا ہوں گی۔ جن میں اعراب وغیرہ کو اہمیت دی جائے اور اُن کی چھپائی بہت صاف ستھری ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد اُردو اور زیادہ دلچسپی سے پڑھا جائے گی۔

ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو زبان اور اس کے تعلیم کا مستقبل روشن ہے کیونکہ مادری زبان والوں سے زیادہ جوش و خروش غیر اردو داں حضرات میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ ایسے ادارے قائم کرنا چاہیے جہاں اردو کی تعلیم کا اور خاص طور پر ثانوی زبان کی حیثیت سے تعلیم کا انتظام ہو۔ اردو کی کلاسیس کا اگر اہتمام شام کے اوقات میں کیا جائے گا تو بہت سے لوگ اپنے ذوق اور شوق کی تکمیل آسانی سے کر سکیں گے اور انشاء اللہ بہت جلد وہ زمانہ پھر آئے گا جب یہ اپنی کھوئی ہوئی مقبولیت پھر سے حاصل کرے گی۔

اُردو کی زبوں حالی

ملک کی آزادی کے سلسلے میں جتنا اہم اوّل اُردو زبان نے انجام دیا ہے شاید ہی کسی دوسری زبان نے دیا ہو کیونکہ یہ ہندوستان کی وہ واحد زبان ہے جو آزادی سے پہلے بھی اور آج بھی سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہر صوبے کا رہنے والا اس زبان کو جانتا ہے اور اس میں بات چیت کرتا ہے کاروبار کے معاملات طے کرتا ہے آزادی سے پہلے بھی اور آج بھی ہندوستان کے ہر صوبے سے اُردو کے اخبار اور رسالے شائع ہوتے رہے ہیں اور آج بھی شائع ہوتے ہیں اس لیے ہندوستان کو ایک کرنے یعنی ملانے اور ہمارے بڑے بڑے نیتاؤں کی آواز کو سارے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچانے کا شرف صرف اُردو زبان کو حاصل ہے۔

لیکن آزادی کے بعد سب سے زیادہ بربادی اور تباہی کا سامنا اسی زبان کو کرنا پڑا جس نے ملک کو آزادی دلانے میں سب سے اہم رول ادا کیا تعصب سے بُرا وقت اس زبان پر آیا اور ہر مصیبت کے لیے

اندو والوں کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا۔

اردو زبان کے بارے میں یہ بات بار بار کہی جاتی ہے کہ "اردو ایک دلکش اور شیریں زبان ہے اسے مٹایا نہیں جا سکتا اور نہ یہ کبھی مرے گی"۔ یہ سچ ہے اور اس جملے کی حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو ستم اردو زبان پر ہوئے اس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ آج ۴۳ سالوں میں تقریباً دو نسلیں اردو رسم الخط سے محروم کر دی گئیں ہیں۔ کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے جسے اردو کا علاقہ کہا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ پورا ہندوستان اس کا علاقہ ہے۔ یہ یہاں پلی بڑھی اور پھولی پھلی ہے جس میں ہندوستان کے ہر صوبے نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ البتہ آج یہ حالت ہے کہ اسکولوں میں اس زبان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اگر کہیں ہے تو وہاں استاد نہیں ہے۔ اگر استاد بھی ہے تو کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ ان حالات سے آج کی اردو گزر رہی ہے پھر بھی زندہ ہے لوگ کہتے ہیں کہ یہ زبان شیریں ہے میں کہتا ہوں سخت جان بھی ہے اس لیے تمام تر لاپرواہیوں کے باوجود اور تعصب کا شکار ہونے کے باوجود اس کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے اور یہ زبان ترقی کر رہی ہے۔ اب تو ہندوستان کے علاوہ انگلینڈ، امریکہ اور عرب ممالک میں اس زبان کی ترقیاں دیکھ کر لوگ حیرت میں پڑ جاتے ہیں جس تیزی سے

وہاں پھل پھول رہی ہے اور ادب لکھا اور پڑھا جا رہا ہے لاتعداد
اخبار اور رسائل نکل رہے ہیں۔ ایک انگریز کے بقول کہ اگر آپ
اُردو یا انگریزی جانتے ہیں تو آپ دُنیا کے کسی بھی حصّہ میں اپنا
کام چلا سکتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اِس زبان کے بولنے
والے ساری دُنیا میں مل جاتے ہیں۔ چینی اور انگریزی زبانوں
کے بعد دُنیا کی تیسری بڑی زبان ہے جو ساری دُنیا میں بولی
اور سمجھی جاتی ہے۔

ہندوستان میں اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا
جا سکتا ہے کہ ثانوی زبان کی حیثیت سے ہر سال لاتعداد طالب علم
اردو لکھنا اور پڑھنا سیکھتے ہیں اور ان کے لیے جگہ جگہ اردو سکھانے
کے مراکز قائم ہیں اور بہت سی یونیورسٹیز میں شام کو ایسی کلاسیس
کا اہتمام کیا گیا ہے جہاں وہ اُردو سیکھ سکیں۔

پروفیسر بھولا ناتھ تیواڑی جو ہندی کے دلدادہ ہیں انہوں
نے کیا خوب بات کہی ہے "اُردو کا رسم الخط سب سے آسان ہے"
اور یہ حقیقت بھی ہے اس کے سہل اور آسان ہونے کی وجہ
اس کی ساخت اور شکلوں و شباہت میں ہم آہنگی ہے اس وجہ
سے تمام حروف کو ۵ یا ۶ گروپوں میں آسانی سے تقسیم کیا جا
سکتا ہے اور ان پانچ یا چھ شکلوں کو آسانی سے نئے طالب علم
نُقطوں اور شوشوں کی مدد سے ذہن نشین کر لیتے ہیں جبکہ

دنیا کی دوسری زبانوں کے رسم الخط بالکل اس کے برخلاف ہیں۔
ان میں ہر حرف کی مختلف شکلیں "فرداً فرداً" یاد کرنا پڑتی ہیں اور
رومن رسم الخط میں ہر حرف کی تین شکلیں یاد کرنی پڑتی ہیں۔
حرف کی بڑی شکل۔ لکھنے کی الگ شکل اور ٹائپ کی الگ شکل
ہوتی ہے۔ جبکہ اردو حروف کی بنیادی شکل ایک جیسی ہی رہتی
ہے بس لکھتے وقت وہی شکل چھوٹی ہو جاتی ہے جنھیں یاد رکھنا
زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس بنا پر بھولا ناتھ تیواڑی کا یہ قول بالکل
صحیح ثابت ہوتا ہے کہ اردو کا رسم الخط سب سے آسان ہے۔
واقعی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے یہ ایسی
سچائی ہے جسے جھٹلانا ممکن نہیں ہے۔

یہ ایک الگ بات ہے کہ اردو مقبول زبان ہونے کے باوجود
ابھی موجودہ سائنسی تعلیمی نظام اور اس کی سہولیات سے محروم
ہے یعنی لسانی اور سائنسی طریقے جن سے دوسری زبانیں فائدہ
اٹھا رہی ہیں اردو میں ابھی مقبول عام نہیں ہو پا رہی ہیں۔ مثلاً
ٹیپ ریکارڈر اور زبان کے پڑھانے کے ریکارڈ یا Language
لیب۔ ویڈیو اور ابتدائی درجات کے لیے درسی کتابوں کی کمی ہے۔
جو کتابیں دستیاب ہیں وہ موجودہ ضروریات کو پورا نہیں کرتی ہیں۔
وہ پرانے انداز سے لکھی گئیں ہیں۔ اب جو نئے لسانی تجربات
ہو رہے ہیں اور جس طرح سے اعراب کی مدد سے اردو پڑھائی

جارہی ہے وہ اُن سے عاری ہیں۔ اس لیے نئے طالب علموں کو خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ایسی کتابیں تیار کرائی جائیں جو موجودہ ضروریات کے مطابق مواد پیش کریں۔ صاف چھپی ہوئی ہوں اعراب کا استعمال ہو۔ اور مرکب الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہو۔ اسی طرح کی ابتدائی کتابوں کی بہت سخت ضرورت ہے۔

ان کتابوں میں طالب علموں کی نفسیات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے اُردو تہذیب جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی جھلکیاں بھی ہونا بہت ضروری ہے۔ اسباق شستہ اور آسان ہونا چاہیئے۔ عربی فارسی کے بڑے بڑے الفاظ سے بھی پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اعراب کی مدد سے چھاپی گئی اس طرح کی کتابیں نئے طالب علموں میں پڑھنے کا شوق پیدا کریں گی۔ اور وہ روانی اور صحیح تلفظ کی ادائیگی کے ساتھ پڑھ سکیں گے۔

بہرحال اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آج کی تعلیم روٹی روزی سے جڑی ہوئی ہے اس لیے لوگ اُردو پڑھنا چاہتے ہوئے بھی نہیں پڑھ پاتے ہیں کیونکہ اُن کے سامنے مستقبل کے بہت سے سوال اُبھرتے ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود ہم اُردو کی موجودہ حالت اور اس کی ترقی سے قطعی ناامید نہیں ہیں بلکہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ لوگوں میں اُردو پڑھنے کا شوق دن بہ دن بڑھ رہا ہے اور باشعور حضرات نے

اُردو کو روٹی روزی کے مسئلہ سے الگ کر دیا ہے۔ وہ اُردو ادب کے مطالعے میں اپنا ذہنی سکون، اپنے دل کی بات اور اچھے اور معیاری ادب کو تلاش کرتے ہیں۔ جو اُن کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے رازوں، خوابوں اور خیالوں کو کھول کر انہیں سوچنے اور سمجھنے کے مواقع عطا کرتا ہے۔

الغرض ہمیں اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے مسلسل اور پُرخلوص محنت کرنا ہوگی۔ کیونکہ پچھلے سالوں میں جو نقصان اردو نے اُٹھایا ہے اُس کی تلافی آسانی سے نہیں ہو سکتی ہے ممکن ہے کہ ہمیں بعض حالات میں اور بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑے لیکن ہمیں بددِل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اُردو زبان کا مستقبل

آج اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں جگہ جگہ بحثیں ہوتی ہیں۔ اور اکثر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پچھلے ۳۴ سالوں میں جو کچھ اردو زبان پر بیتا ہے کیا اس کے باوجود اردو اب تک زندہ ہے لیکن اس کا مستقبل کیسا ہوگا۔ کیونکہ اس زبان کو حکومت کی سرپرستی تو حاصل نہیں ہے۔ یہ عوامی زبان ہے اور عوام کے دم پر ہی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ اردو کے چمن میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب نے ہی آبیاری کی ہے تب ہی وہ ملک کی شیریں زبان بنی ہے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جس زبان کو بھی دنیا میں حکومت کی سرپرستی حاصل ہو گئی ہے اس نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے اس کی بہترین مثال ہمارے سامنے ہندی کی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہندی نے اتنی ترقی نہیں کی جتنی اسے اس حالت میں کرنا چاہیے تھی لیکن اس نے کسی طرح سے اردو کو نقصان نہیں پہنچایا۔ سوائے اس کے کہ اسکولوں اور دفاتر سے نکال دی گئی اور لوگ اس کی تعلیم سے محروم ہو گئے۔

لیکن پھر بھی لوگوں کے دلوں میں یہ زندہ رہی اور زندہ ہے اس کے پڑھنے اور سیکھنے والوں کی چاہت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

لیکن پھر بھی چند لسانی اصولوں کے تحت دیکھنا ہوگا کہ کیا واقعی اُردو کا مستقبل روشن ہے۔ عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ جس زبان کے بولنے والوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی وہ زبان اتنی ہی طاقت ور ہوگی۔ ساتھ ہی اس کا ایک علاقہ بھی ضروری ہے۔ جب اس اصول کے تحت ہم اردو کو دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو کا اپنا کوئی علاقہ تو نہیں ہے البتہ یہ پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کے اخبار اور رسائل کلکتہ، مدراس اور بنگلور جیسی جگہوں سے شائع ہوتے ہیں اور اس کے بولنے والے سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اردو زبان کی مقبولیت میں اس کی شاعری کو کمال حاصل ہے اس وجہ سے بھی دوسری زبانوں کے جاننے والے اس زبان کو سیکھنا پسند کرتے ہیں تاکہ اس کی شاعری کا لطف لے سکیں۔ یہ اردو کی مقبولیت کا راز ہے جو اس کے بولنے والوں میں دن بدن اضافہ کر رہی ہے اور یہ اس زبان کے زندہ ہونے کا ثبوت بھی ہے۔

اُردو ایک بڑی زبان ہے اس میں تمام لسانی تقاضے موجود ہیں۔ جو ایک ماہر لسانیات کسی زبان میں تلاش کرتا ہے۔ مثلاً اس کے بولنے والے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پڑھے لکھے اور جاہل سب ہی اس زبان کو بولتے ہیں اور بغیر کسی تحصیل کے اس زبان میں اپنے مقاصد بیان کرتے

ہیں۔ نئے نئے الفاظ اس زبان میں وقت کی ضرورت کے مطابق داخل
ہوتے رہتے ہیں۔ اردو نے بہت سے جدید انگریزی اور ہندی کے الفاظ
اپنے اندر سمو لیے ہیں۔ اس طرح الفاظ کا خزانہ دن بہ دن بڑھتا جا
رہا ہے۔ جو اس زبان کی زندگی کی علامت ہے۔
زبان کا معاشرے سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے اور اردو زبان نے اپنے
وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ ایک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کو جنم دیا وہی تہذیب
اور اس کے بولنے والے اس کے معاشرے میں شامل ہو گئے اس تہذیب
نے اس زبان کو بہت سہارا دیا۔ اور اعلیٰ معیار پہ پہنچایا۔ دوسری قومیں
اس ملی جلی تہذیب اور اردو زبان کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتی
ہیں اور آج بھی یہ ملی جلی تہذیب دوسرے لوگوں کو متوجہ کر رہی ہے اور اس
تہذیب کو سیکھنے اور سمجھنے کے لیے لوگ اردو پڑھ رہے ہیں جس سے
اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے اور زبان ترقی کر رہی ہے۔
آج جبکہ حالات بدل رہے ہیں اور زمانہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔
تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا اردو ان تبدیلیوں کا ساتھ دے رہی ہے تو
جہاں تک میں محسوس کرتا ہوں اردو نے ہمیشہ وقت کا ساتھ دیا ہے۔
اور ہمیشہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلی ہے اور اپنے اندر وقت
بدلنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کے خزانے میں اضافہ کیا ہے۔ نئے نئے الفاظ
اس میں داخل ہوئے ہیں جو ماحول اور تبدیلیوں کو اپنے اندر سمو کر کچھ بھی لکھنے
کے قابل رہی ہے یہ ایک ترقی یافتہ زبان کی خوبی ہے جو اس زبان میں موجود ہے۔

مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں بھی اُردو پر ہمیشہ اثر انداز ہوتی رہی ہیں اسی لئے شمالی ہند کی اُردو اور دکنی اُردو میں خاصہ فرق ہے۔ دکن میں جو اردو بولی جاتی ہے اس میں دکنی الفاظ زیادہ ہیں تو شمالی ہند میں بولی جانے والی اُردو میں برج بھاشا کھڑی بولی اور دوسری شمالی زبانوں کے الفاظ زیادہ ہیں۔ بنگال کی اُردو پر بنگالی کا اثر ہے۔ تو پنجاب کی اردو پر پنجابی زبان کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اُردو نے ہر زبان کے الفاظ کو اپنے اندر سمو کر ایک نیا رنگ اختیار کیا ہے۔ جو سب سے جدا ہے۔

اردو زبان کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس سے اس کے بولنے والوں کو بہت محبت اور عقیدت ہے یہ اپنے بولنے والوں میں بہت مقبول ہے حالانکہ یہ کہا جاتا ہے کہ جو شخص بچپن سے جس زبان کو بولتا ہے وہ اسے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ یہ اصول اردو پر صحیح ثابت نہیں ہوتا ہے۔ اردو سے محبت اور عقیدت رکھنے والوں کی تعداد اس وقت سارے ہندوستان میں بہت زیادہ ہے جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے۔ جنہوں نے اردو کو شوقیہ پڑھا ہے۔ وہ اپنے دفاتر اور تجارتی مقاصد کے لئے انگریزی کا استعمال کرتے ہیں اور گھروں میں بنگالی پنجابی یا کوئی اور دوسری زبان بولتے ہیں لیکن جب دلی جذبات کو بیان کرنے کا موقع آتا ہے تو اردو میں لکھتے ہیں اور اُردو کی کتابیں پڑھتے ہیں کیونکہ دلی جذبات کی صحیح غمازی اُردو ہی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی شاعری اور افسانہ دوسری سبھی زبانوں کے مقابلے میں سب سے آگے ہے۔

ان جذباتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو زبان کا مستقبل روشن ہے یہ زبان انشاء اللہ برابر ترقی کرتی رہے گی۔ اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتی رہے گی۔ اس کو حکومت کی سرپرستی حاصل نہ بھی لیکن کیونکہ یہ لوگوں کی دلوں میں راج کرتی ہے اس لئے ہمیں اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی پریشانی یا فکر کی ضرورت نہیں ہے اس کا مستقبل روشن اور درخشاں ہے۔

جیساکہ

نام سے ظاہر ہے

"اردو کی درس و تدریس کے مسائل"

واقعی وہ مسائل ہیں

جن سے

موجودہ دور کے اساتذہ آئے دن دوچار

ہوتے رہتے ہیں

ڈاکٹر ہارون ایوب نے بہت خوش اسلوبی سے

انھیں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ

لسانیات کی روشنی میں ان کا

حل

تلاش کرنے کی کوشش کی ہے

اس کتاب کا مطالعہ

اساتذہ اور طلباء کے ساتھ

عام قاری

کے لئے بھی

دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

پبلشر

مصنف کی دیگر مطبوعات

"اردو ناول پریم چند کے بعد"

یہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ اس مقالے میں پریم چند کے

بعد کے ناولوں اور ناول نگاروں کو زیر بحث لایا گیا ہے جنہوں نے ناول کے فن

کو کسی نہ کسی انداز سے نیا روپ عطا کیا ہے۔ یہ مصنف کی زبردست کاوش فکر

کی ایک کارآمد اور معیاری تخلیق ہے۔

درد آہٹوں کا (ناول)

خود زندگی

دنیا کا سب سے بڑا ناول ہے

جس میں درد بھی ہے تو خوشیاں بھی۔ خوشیاں چلتی ہوئی آتی ہیں اور بقول

فیض احمد فیض " درد آئے گا دبے پاؤں "

ڈاکٹر ہارون ایوب کے ناول " درد آہٹوں کا "

جو نئے دور نئی تہذیب اور نئے سماجی زاویوں کی کہانی ہے۔

بھوپال بک ہاؤس۔ بدھوارہ۔ بھوپال (ایم پی)